

نظام تعلیم

مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت

نظام تعلیم کے موضوع پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریروں اور تقریروں کا مجموعہ، جن میں حضرت مولانا نے نظام تعلیم کی اہمیت، اسلامی ممالک میں ذہنی کشمکش اور اس کے اسباب، مغربی نظام تعلیم کی زہرناکی اور اس کے اثرات بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ پوری دنیا کا نظام تعلیم اپنی افادیت بڑی حد تک کھو چکا ہے، اور اب نئے سرے سے نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت ہے، اور اس کے لیے قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے، اور اقوام و ملل اور تاریخ انسانی کے وسیع تجربات سے رہنمائی حاصل کرنے پر زور دیا ہے، اسی کے ساتھ اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ نظام اور نصاب تعلیم کو ملت کے اساسی مقاصد کا تابع اور خادم ہونا چاہیے، نیز ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس پر ایرانی اثرات کے ذکر کے ساتھ اس کی خصوصیات بھی ذکر کی ہیں۔

ترتیب و تدوین:

عبدالہادی اعظمی ندوی

ناشر

دارالاشاعت، کراچی

کتاب کے جملہ حقوق بھارت میں سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی کے نام محفوظ ہیں،
پاکستان میں دارالاشاعت، کراچی کے نام محفوظ ہیں۔
کوئی بلا اجازت طبع کرنے کی جرأت نہ کرے۔
دوسرا ایڈیشن اہم اضافوں اور ترمیمات کے ساتھ

کتاب : نظام تعلیم - مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت
(مجموعہ مضامین و تقاریر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

ترتیب و تدوین : عبدالہادی اعظمی ندوی

صفحات : ۱۰۴

تعداد :

اکتوبر ۲۰۱۳ء

ملنے کے پتے :

ناشر :
دارالاشاعت، کراچی

فہرست

- ۶..... عرض ناشر
- ۸..... عرض مرتب
- ۲۲..... نفسیاتی کشمکش
- ۲۲..... فکری و ذہنی ارتداد
- ۲۳..... حالات و واقعات کا منطقی نتیجہ
- ۲۳..... اسلامی سوسائٹی اور نفاق
- ۲۴..... منافقین کو تسلط کیوں کر حاصل ہوا؟
- ۲۵..... حضرت حسن بصریؒ کا تجزیہ
- ۲۶..... مغرب کی فکری و تہذیبی بیلغار
- ۲۷..... فکری اضطراب
- ۲۸..... تعلیم کوئی تجارتی سامان نہیں
- ۳۰..... مغرب کا طریقہ کار
- ۳۱..... مغرب اس نقصان سے محفوظ کیوں؟
- ۳۲..... اسلامی ممالک میں کشمکش کیوں؟
- ۳۳..... از سر نو پورا نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت
- ۳۵..... عالم اسلام کا سب سے بڑا چیلنج
- ۱۰..... مراحق سے فصل بہار پر
- ۱۱..... اقبال کے تعلیمی افکار
- ۱۱..... برصغیر ہندو پاک کا امتیاز
- ۱۳..... ممالک اسلام میں کشمکش کا بنیادی سبب
- ۱۵..... نور ایک ہے اور ظلماتیں بے شمار ہیں
- ۱۵..... مغربی تعلیم کی زہرناکی
- ۱۶..... ترقی یافتہ مسلم ممالک کی المناک کہانی
- ۱۷..... یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
- ۱۸..... دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا
- اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت اور وہاں کی قیادت اور فکری رجحانات میں اس کے دور رس اثرات (۲۰-۳۵)
- امت مسلمہ اور عالم اسلام کی موت و زیت کا مسئلہ
- ۲۰.....
- ۲۱..... ایک نفسیاتی حقیقت
- تعلیم کی کامیابی و ناکامی
- ۳۶.....
- ۳۷..... اسلامی مفکرین کی ذمہ داری
- ۳۷..... دعوت و تعلیم اسلامی کی پہلی تجربہ گاہ
- ۳۸..... مرکز حج و عبادت
- ۳۹..... تعلیمی کوششوں کا نتیجہ
- نظام تعلیم و تربیت کا معاشرہ اور اس کے رجحانات سے گہرا تعلق ہے (۳۶-۴۷)

نظام تعلیم میں نظر ثانی کی ضرورت (۶۸-۸۰)

- ۶۸ تعلیم کا مسئلہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے
- ۶۹ نظام تعلیم کی مہویت
- ۶۹ درس نظامی
- ۷۰ ساری دنیا کا نظام تعلیم اصلاح طلب ہے
- ۷۰ معاشیات و سیاسیات کی طرف ضرورت سے زیادہ توجیہ
- ۷۱ علامہ اقبال کا نظریہ
- ۷۱ اقبال کے الفاظ میں ایک شکوہ
- ۷۲ اسلامیات پر مزید توجیہ کی ضرورت
- نظام تعلیم کے لیے ایک نئے اجتہاد کی ضرورت
- ۷۳ ہے
- ۷۳ فن تعلیم اور نظام تعلیم کے اصول
- ۷۴ استاد کو فن تعلیم سے فطری مناسبت ہو
- ۷۴ استاد مجتہد ہو
- ۷۵ استاد داعی ہو
- ۷۵ کامیاب معلم
- ۷۷ دینیات کی تعلیم کی کامیابی کا سب سے بڑا راز
- ۷۷ از سر نو نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت
- ۷۸ کیمبرج اور آکسفورڈ میں تعلیمی قدامت
- ۷۸ ہندوستان کا نظام تعلیم نہ مشرقی ہے نہ مغربی
- ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو سیاسی اثرات سے آزاد ہو
- ۷۹ نظام تعلیم کے لیے قرآن سے ہدایت حاصل کیجیے!
- ۷۹ ناکام نظام تعلیم

- ۴۰ مادیت کا ہسٹریا
- ۴۱ رضا کارانہ خدمت کی ضرورت
- ۴۲ نشر و اطلاع
- ۴۲ آج کا مسلمان نوجوان
- ۴۳ ادبی ارتداد
- ۴۴ تفریحی سامان کی کثرت - ایک لمحہ فکریہ
- مغرب میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان - سنگین خطرہ
- ۴۴ تعلیم نسواں
- ۴۵ مقام عبرت و نصیحت
- ۴۶ مقام عبرت و نصیحت

نظام تعلیم و تربیت کی بنیادیں (۶۷-۶۸)

- ۴۸ حکمت مومن کی گم گشتہ دولت ہے
- ۴۸ جہالت کے خلاف جنگ
- ۵۰ مسرت و شادمانی کا احساس
- ۵۰ خوف و اندیشہ
- ۵۱ احتساب و جہاں بانی
- ۵۲ آزادی فکر اور روسی نظریات
- ۵۳ سرمایہ دارانہ نظام تعلیم
- ۵۵ اسلامی نظام تعلیم و تربیت
- ۵۸ عقلی نابالغی
- مغربی مفکرین و ماہرین تعلیم کے رجحانات و افکار
- ۵۹ تعلیم فی نفسہ مقصود نہیں
- ۶۳ سطحی انداز فکر
- ۶۳ ایک حقیقت
- ۶۴ ہم کیا کریں؟
- ۶۵ ہم کیا کریں؟

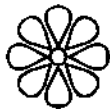
ہندوستان میں مسلم بچوں کا تعلیمی مسئلہ
(۹۳-۱۰۴)

- ۹۳ شیرازہ ہند جو نیور کی علمی تاریخ.....
سلطان وقت علم کے بور یہ نشین پر قربان
ہوتا ہے.....
۹۴ جو نیور میں علم اور علماء.....
۹۵ قدیم اور جدید طرز حکومت کا موازنہ.....
حکومت درحقیقت ایک اتالیق اور سرپرست کی
حیثیت رکھتی ہے.....
۹۶ زیرِ قدمت ہزار جان است.....
۹۷ جبری تعلیم - اندیشے اور نقصانات.....
۹۸ دانشندانہ طرز عمل.....
۹۸ تعلیم میں اخلاقی عنصر.....
۹۹ حیرت اور مایوسی.....
۹۹ دیومالائی اثرات.....
حکومت کی زیر نگرانی تیار کردہ نصاب میں
جاندارانہ طرز عمل.....
۱۰۰ ایک کھلی نا انصافی.....
۱۰۱ ایک اہم مسئلہ.....
خلاف عقل و عدل تعلیمی صورت حال اور اس کا
مقابلہ.....
۱۰۲ صبا حی و مسائی مکاتب کا قیام.....
۱۰۳ دو طاقتیں.....
۱۰۴ ایک اہم مطالبہ.....

- ۸۰ قدیم دینی مدارس کا کارنامہ.....
۸۰ انتہائی حساس اور نازک کام.....

نصاب تعلیم قوم کے فکری ارتقا اور ذہنی
صلاحیت کا آئینہ دار ہوتا ہے
(۸۱-۹۴)

- ۸۱ نصاب تعلیم کا مسئلہ.....
۸۲ قدیم نظام تعلیم پر ایرانی اثرات.....
۸۳ حدیث کے ساتھ بے اعتنائی کے اسباب.....
۸۴ دقت پسندی.....
۸۵ تعدد و تنوع.....
۸۵ ایک لطیفہ.....
۸۶ فقہ و قانون.....
۸۷ درس نظامی کی خصوصیات.....
۸۸ قدیم نصاب تعلیم کی نفسیات.....
نصاب تعلیم کا زندگی اور معاشرے سے مستحکم
رابطے.....
۸۹ نصاب تعلیم میں تبدیلی علمی نقطہ نظر اور معروضی
طرز بقیہ پر ہو.....
۸۹ نصاب تعلیم میں تبدیلیاں عہد بہ عہد ہوتی رہیں.....
۹۰ طرز بقیہ تعلیم اور نصاب تعلیم میں خوب سے خوب
ترکی تلاش طلبہ کا واجبی حق ہے.....
۹۱ نصاب تعلیم کو ملت کے اساسی مقاصد کا تابع اور
خادم ہونا چاہیے.....
۹۲



عرض ناشر

تعلیم کا مسئلہ ہر ملک کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے، کسی بھی ملک یا قوم کی ترقی کے لیے یہ ایسی شاہ کلید ہے کہ جس سے پھر سارے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں، مسلمانوں نے جب تک اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا وہ دنیا کے منظر نامہ پر چھائے رہے اور انہوں نے دنیا کو علم کی روشنی سے بھر دیا، انہوں نے تعلیم کے لیے کچھ بھی دوئی نہیں برتی، اور اس کو انسانیت کی فلاح و بہبودی کا ذریعہ بنایا، لیکن جب مسلمانوں کی غفلت کے نتیجے میں پوری دنیا اخلاقی بحران کا شکار ہو گئی تو عالم اسلام خاص طور پر اس سے متاثر ہوا، اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے اپنی بنیادی فراموش کر دی، اور عرصہ کے بعد جب دوبارہ بیداری پیدا ہوئی تو اس نے وہی نظام تعلیم اختیار کر لیا جو یورپ کا تیار کردہ تھا، اس کی بڑی وجہ برطانیہ و فرانس کا سامراجی نظام ہے، جو دنیا کے اکثر حصہ پر قائم رہا، اور جب سیاسی مجبور یوں کی بنا پر ملکوں کو آزاد کیا گیا تو جسم تو آزاد ہو گیا، لیکن عرصہ تک غلامی میں رہنے کی وجہ سے ذہن و دماغ غلامی کے شکنجے میں جکڑے رہے، اور ان ملکوں میں یورپ نے جو نظام تعلیم جاری کیا تھا وہی نظام سامراجی دور کے بعد بھی قائم رہا، اس چیز نے پورے عالم اسلام کو متاثر کیا، خود اسلامی ملکوں میں پڑھنے والوں کا حال یہ ہوا کہ وہ اپنی اپنی یونیورسٹیوں سے پڑھ کر نکلے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ یورپ کے پروردہ ہیں، ان کے ذہن و دماغ وہیں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اور خود وہیں کی تہذیب میں رنگے ہوئے۔

ان مشرقی ملکوں کا مزاج اور وہاں کی روایات کا یورپ کے اپنے اصولوں اور روایات سے کوئی جوڑ نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ملکوں میں ایک کشمکش کی فضا پیدا ہو گئی، اسلامی ملکوں

میں قدرتی طور پر یہ کشمکش زیادہ وسیع پیمانہ پر اور شدت کے ساتھ پیدا ہوئی اور ان ملکوں کی صلاحیتیں ان ہی آپس کے نزاعات میں ضائع ہونے لگیں، جو خانہ جنگی تک پہنچ گئے تھے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان اسلامی ملکوں میں ذہنی کشمکش کا بنیادی سبب اسی نظام تعلیم کو قرار دیا ہے، اور از سر نو پورا نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے، اور اس کو عالم اسلام کا سب سے بڑا چیلنج قرار دیا ہے، کسی بھی ملک میں اصلاح و انقلاب کا سب سے بڑا ذریعہ حضرت مولانا تعلیم ہی کو قرار دیتے ہیں، اور اس کے لیے نظام تعلیم کو ملک کے مزاج و مذاق سے ہم آشنا بنانا مولانا کے نزدیک سب سے ضروری ہے، اور اس میں سب سے بڑی ذمہ داری اسلامی ملکوں کی ہے جن کے پاس وہ بلند آسمانی تعلیمات ہیں جو علم کی نہ صرف آبیاری کرتی ہیں، بلکہ اس کی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیتی ہیں۔

حضرت مولانا کی تقریروں، اور تحریروں کا یہ اہم موضوع رہا ہے، بڑی خوشی کا موقع ہے کہ عزیز القدر مولوی عبدالہادی اعظمی ندوی سلمہ نے متفرق تقریروں اور مضامین کو جمع کر کے ان کو کتابی شکل دی، علم کے موضوع پر اکیڈمی سے شائع ہونے والی حضرت مولانا کی یہ دوسری کتاب ہے، امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اس میں سب حصہ لینے والوں کو اجر عطا فرمائے۔

بلال عبداللہ حسنی ندوی

مرکز الإمام أبي الحسن الندوي
دار عرفات، تملیہ کلاں، رائے بریلی

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض مرتب

الحمد لله حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه، مباركاً عليه، كما يحب ربنا ويرضى، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأشهد أن سيدنا محمداً عبده ورسوله، وبعد!

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعہ مضامین و تقاریر کی یہ تیسری کڑی ہے جو ”نظام تعلیم - مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت“ کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے۔

اس کتاب میں کل سات مضامین و تقاریر ہیں، جن میں حضرت مولانا نے نظام تعلیم کی اہمیت، اسلامی ممالک میں چنی کھنکاش اور اس کے اسباب، مغربی نظام تعلیم کی زہرناکی اور اس کے اثرات بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ پوری دنیا کا نظام تعلیم اپنی افادیت بڑی حد تک کھو چکا ہے، اور اب نئے سرے سے نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت ہے، اور اس کے لیے قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے، اور اقوام و ملل اور تاریخ انسانی کے وسیع تجربات سے رہنمائی حاصل کرنے پر زور دیا ہے، اسی کے ساتھ اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ نظام اور نصاب تعلیم کو ملت کے اساسی مقاصد کا تابع اور خادم ہونا چاہیے، نیز ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس پر ایرانی اثرات کے ذکر کے ساتھ اس کی خصوصیات بھی ذکر کی ہیں۔

راقم السطور نے ان مضامین و مقالات کی ترتیب میں طبعاتی اغلاط کی تصحیح کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے، اسی طرح ذیلی عنادین بھی قائم کیے ہیں، نیز آیات قرآنیہ کے حوالوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

پہلا ایڈیشن رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ مطابق اگست ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا تھا، اب دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کی طباعتی اغلاط کی کھج کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، حضرت مولانا کے حواشی کے آگے بین القوسین ”ح“ کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اسی طرح بعض دیگر جزوی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ راقم السطور کی اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبولیت سے نوازے، اور اس کے نفع کو عام فرمائے، آمین۔

عبدالہادی اعظمی ندوی

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ

اسلامی ممالک میں ذہنی کشمکش

اور

اس کے اسباب^(۱)

الحمد لله وحده و الصلاة و السلام على من لا نبى بعده.
و اُس چانسلر، اساتذہ کرام، برادران عزیز!

مرا حق ہے فصل بہار پر

اس جامعہ کی نسبت جس گرامی شخصیت سے قائم ہے، اس کی دعوت پر مجھے یہاں آنے سے جو مسرت ہوئی، وہ کم دانش گاہوں میں جانے سے ہوئی ہوگی، میں اپنی اس تقریر کا آغاز فارسی کے اس مشہور مصرع سے کرنا چاہتا تھا کہ رع
غریب شہر سخفہائے گفتنی دارد

لیکن چونکہ اس جامعہ اور اس دانش گاہ کی نسبت اقبال سے ہے، اس لیے اب میں اس کے بجائے جگر کا مصرع پڑھوں گلاع

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر
یہ اگر اقبال کا چمن ہے تو میں بھی اس کا بلبل ہوں، اور مجھے اس چمن کے کسی بھی شاخسار پر بیٹھنے کا حق ہے، اس لیے میں غریب شہر نہیں ہوں، مجھے اس شہر کا ایک باشندہ یا اس چمن کا ایک بلبل سمجھئے۔

(۱) علامہ اقبال اپون یونیورسٹی (اسلام آباد) میں ۱۸ جولائی ۱۹۷۸ء کو کی گئی تقریر۔

اقبال کے تعلیمی افکار

حضرات! وقت بہت کم ہے، اور اقبال نے تعلیم پر جو کچھ لکھا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے، اور میں یہ گزارش کروں گا اس جامعہ کے ذمہ داروں سے کہ اسے ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے یہاں نصاب میں داخل کریں، تعلیم کے بارے میں اقبال کا نقطہ نظر اور اقبال کی تفہیم اور ان کے خیالات پر اگرچہ مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کو علاحدہ کر کے اور مستقل فن اور مستقل موضوع بنا کر اس جامعہ میں تحقیقی کام ہونا چاہیے، اقبال ان چند خوش قسمتوں میں سے تھے، جو خود اپنے الفاظ میں جدید نظام تعلیم کے آتشکدہ یا نارنمرود میں بیٹھ کر بہت کچھ ابراہیمی خصوصیات کے ساتھ نکلے۔

انہوں نے اس پر بھی فخر کیا ہے کہ میں اس جال میں پھنسا تھا، لیکن اس کا دانہ لے کر نکل گیا، میرے بال و پر اس جال میں پھنسنے نہیں رہے:

طلم علم حاضر را شکستم ربودم دانہ و دامش کستم
خدا دانہ کہ مانند براہیم بنار اوچہ بے پروا نشستم

برصغیر ہند و پاک کا امتیاز

مشرقی ممالک کے نوجوان مغرب اور خاص طور پر انگلستان، جس کو ہندوستانی ولایت کے نام سے یاد کیا کرتے تھے، تعلیم کے لیے جایا کرتے تھے، (اقبال کے لیے معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں) جو بڑے اقبال مند ہوتے تھے، ان کو وہاں کا سفر نصیب ہوتا تھا، وہ اس پر پھولے نہیں سماتے تھے، میرے شعور کی آنکھیں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر کھلی ہیں، میں نے تحریک خلافت کو بہت قریب سے دیکھا ہے، میں اس کا ایک طرح سے معاصر وہم عمر ہوں، اس زمانے میں انگریز کا طوطی بولتا تھا، کسی کھاتے پیتے گھر کے لیے سب سے بڑے فخر کی بات یہ تھی کہ فلاں زمیندار صاحب، فلاں سید صاحب، فلاں شیخ صاحب، فلاں خان صاحب کے صاحبزادے ولایت گئے ہیں، اس وقت مصر و شام سے کم، ہندوستان سے زیادہ

مغربی ممالک کی طرف نوجوانوں کا رخ تھا، غیر منقسم ہندوستان سے اس وقت بہترین جوہر، اور بہترین صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان انگلستان گئے اور وہاں خاص طور پر آکسفورڈ اور کیمبرج میں انھوں نے تعلیم پائی، ہم برصغیر کے مسلمان اس پر فخر کر سکتے ہیں کہ وہاں کے اسلام سوز اور اخلاق سوز ماحول کے اثرات سے جو لوگ آزاد ہو کر نکلے بلکہ ایک طرح سے باغی ہو کر نکلے، ان میں ہم دو شخصیتوں کے نام لے سکتے ہیں، ایک علامہ اقبال اور ایک مولانا محمد علی جوہر، مصر بلکہ مشرق وسطیٰ کو بھی اپنی طویل تاریخ میں یہ فخر حاصل نہیں، وہ کسی ایسے مغربی نوجوان تعلیم یافتہ کا نام نہیں لے سکتا جس نے اقبال کی طرح اپنی خودی کو قائم رکھا ہو، بلکہ وہ خودی کا مبلغ بن کر آیا ہو، اور مولانا محمد علی جوہر جیسا جوہر قابل جو اس تہذیب کا باغی، اس ملک کا باغی اور ایک شعلہ جو الہ بن کر آیا، یہ ہمارے اس تختی براعظم کے لیے فخر کی بات ہے، کم سے کم یہ دو نام ہیں جن کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا، ورنہ میں اور بھی بہت سے نام پیش کرتا جو وہاں سے کچھ لے کر آئے، کچھ کھو کر نہیں آئے، حقیقت کا علم تو صرف اللہ کو ہے، لیکن ہم اقبال کا کلام پڑھتے ہیں، مولانا محمد علی جوہر کی تحریریں پڑھتے ہیں، کامریڈ میں اور ہمدرد میں، تحریک خلافت میں انھوں نے جو قائدانہ کردار ادا کیا، اس کو دیکھتے ہیں، ان کی تقریریں پڑھتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کا فکری طور پر اقبال سے بڑھ کر باغی، اور مغربی سیاست اور تمدن کا محمد علی سے بڑھ کر باغی مشرق کے اسلامی ممالک میں نہیں ملتا، اقبال نے اس پر بجا فخر کیا ہے، انھوں نے کہا ہے:

نشستم بانگویان فرنگی
ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

میں خوبان فرنگ کے ساتھ بیٹھا (ان کی مراد جمال علمی و جمال تہذیبی سے ہے) اپنی عمر میں کوئی ایسا بے نوردن یا ندین جو ویسا گزرا ہو، کبھی انھوں نے کہا:

ز مستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی

نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

انھوں نے اپنی خودی کو برقرار رکھا، بلکہ وہ خودی کے مبلغ بن کر آئے، انھوں نے مغربی

علوم کے قلب و جگر میں اتر کر مغرب کی کمزوری کو دیکھا، اور اس سے فائدہ اٹھایا، آپ کی اس جامعہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کا انتساب اقبال سے ہے۔

ممالک اسلامیہ میں کشمکش کا بنیادی سبب

وقت کم ہے، آپ کے سامنے ایک مسئلہ رکھنا چاہتا ہوں، جس پر ہماری تمام جامعات کے دانشوروں کو اور ہمارے تعلیمی پالیسی بنانے والوں کو غور کرنا چاہیے، ابھی دو تین سال کا واقعہ ہے کہ میں بیروت گیا، میرے ایک بڑے ذہین و صاحب علم دوست مجھے اپنی گاڑی پر بیروت کی سیر کرا رہے تھے، انھوں نے گاڑی چلاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ مولانا! آپ سے میں ایک سوال کرتا ہوں کہ ممالک اسلامیہ میں جو ذہنی، فکری و سیاسی بے چینی اور کشمکش پائی جاتی ہے، یہ غیر اسلامی ممالک میں کیوں نہیں پائی جاتی؟ یہ ہندوستان، جاپان و سیلون میں کیوں نہیں پائی جاتی؟ یہ اسلامی ممالک کے ساتھ کیوں مخصوص ہے؟ یہاں ایک صف آرائی اور قیادتوں اور عوام میں دو مقابلہ محاذ بنے ہوئے ہیں، اس کے نتیجے میں انقلابات کثرت سے آتے ہیں، حکومتیں تبدیل ہوتی ہیں، عوام کو اپنے قائدوں اور حکمرانوں پر بھروسہ نہیں، اور برسر اقتدار طبقہ کو عوام کی طرف سے اطمینان نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ میں ان کے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا، ان کو باتوں میں مشغول رکھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ خود میرے ذہن کے اندر ایک سوال پیدا ہو گیا کہ شاید اس سے پہلے یہ سوال میرے ذہن میں نہیں تھا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اور اس بے چینی کے کیا اسباب ہیں؟ روز ہم سنتے ہیں کہ ان ملکوں میں مستقل ٹکراؤ ہے، وہاں تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے، مستقل فلسفہ اخلاق کا ٹکراؤ ہے، بعد میں میرے ذہن میں اس کا ایک جواب آیا، وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، جس کی وجہ سے مجھ پر اور آپ پر اور ان جامعات کے ذمہ داروں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

بات یہ ہے کہ جو فلسفہ تعلیم ان غیر اسلامی ممالک میں آیا، وہاں کے اقدار اور بنیادی عقائد سے متصادم نہیں تھا، ان اقدار میں اول تو جان نہیں تھی، جان تھی بھی تو ان میں ہر نئے فلسفہ کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی، ان کی تو بنیاد ہی مستحکم نہیں، بہت سیال و رقیق قسم کی چیزیں ہیں،

مثلاً میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ جب جواہر لال صاحب سے پوچھا گیا کہ ہندو کی کیا تعریف ہے؟ تو انھوں نے بہت سوچنے کے بعد کہا کہ جو اپنے کو ہندو کہے وہ ہندو ہے، ہمارے ایک دوست نے واقعہ سنایا، وہ محکمہ تعلیم کے آدی تھے، کہ ہم لوگ اسٹاف روم میں بیٹھے ہوئے تھے، میں نے اپنے ایک ہندو پروفیسر دوست سے کہا: پروفیسر صاحب! ہم سے اگر پوچھا جائے کہ دولفظوں میں اسلام کا خلاصہ بیان کر دو تو ہم کہیں گے: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللَّهِ پر ایمان رکھنا ہے، اگر آپ سے پوچھا جائے کہ دولفظوں میں آپ ہندوئیت کی تعریف کر دیجیے تو آپ کیا کہیں گے؟ اور دیکھیے کسی گہرے فلسفے کی ضرورت نہیں ہے، میری لائبریری میں بہت سی کتابیں ہیں، میں پڑھ لوں گا، آپ تو اس وقت دولفظوں میں بتا دیجیے کہ اگر مجھ سے ہی کوئی پوچھے کہ ہندو کسے کہتے ہیں اور اس کی کیا تعریف ہے، تو میں کیا جواب دوں؟ تھوڑی دیر سوچتے رہے، کہنے لگے: مسٹر قدوائی! اصل بات یہ ہے کہ جو کسی چیز میں Believe نہیں کرتا، وہ بھی ہندو ہے، اور جو ہر چیز میں Believe کرتا ہے وہ بھی ہندو ہے، تو ان کا نظام عقائد اگر ہے تو وہ اتنا روادار ہے کہ ہر فلسفہ کا ساتھ دے سکتا ہے، اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں، اس لیے فرض کیجیے کہ مغرب کا نظام تعلیم جب ہندوستان میں آیا تو اس نے ہندو سوسائٹی میں کوئی بے چینی پیدا نہیں کی، کچھ پرانے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ سمندر کا سفر نہیں کر سکتے، صبح کا نہانا ضروری ہے، اس کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتے، اس کے اندر کیا جان ہے؟ تھوڑے دنوں کے اندر معلوم ہو گیا کہ ہم نے بے سوچے سمجھے باتیں قبول کر لی تھیں، یہ موجودہ تمدن کے ساتھ نہیں چل سکتیں، لیکن اصل مسئلہ پیش آیا ہمارے مسلم معاشرہ کو، وہاں توحید کا ایک مفہوم ہے، اس کے متعین حدود ہیں، کہ یہاں تک ایمان ہے، اس کے بعد کفر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، ایک وقت میں آدی کئی مذاہب کا وفادار نہیں ہو سکتا، بیک وقت آدی توحید و شرک کو جمع نہیں کر سکتا، اور یہ خیال کہ مغرب سب کچھ ہے، اور وہی قیادت کا اہل ہے، پھر اس کے بعد رسول اکرم ﷺ کو داعی و عالمی رہنما اور معیار ماننا اقبال ہی کے الفاظ میں کہ

وہ دلائل سبل ختم الرسل مولاے کل جس نے غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

نور ایک ہے اور ظلمتیں بے شمار ہیں

وہ رسول اللہ ﷺ کو دانا نئے سبل، ختم الرسل، مولائے کل بھی سمجھے، اور مغربی تہذیب کو حرف آخر بھی سمجھے، سائنس کو علم کی معراج بھی سمجھے، دونوں باتیں جمع نہیں ہو سکتیں، اس لیے بے چینی ان ملکوں میں نہیں ہو سکتی جہاں مذہب کا کوئی مثبت معین نظام نہیں تھا، جس کو کسی بات پر اصرار نہیں کہ یہ ہدایت ہے، یہ ضلالت، ﴿فَمَاذَا بَعَدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّى تُصِرُّونَ﴾ [سورۃ یونس: ۳۲] ہدایت کے بعد ضلالت کے علاوہ باقی کیا رہتا ہے؟ وہ کہتا ہے: نور ایک ہے، ظلمات بے شمار ہیں، آپ قرآن مجید میں دیکھیے، کہیں نور کی جمع استعمال نہیں ہے، کیا عربی میں نور کی جمع آتی نہیں؟ کوئی طالب علم کہہ دے: ”انوار“ آتی ہے، آپ کے یہاں کتنے بھائیوں کے نام انوار ہوں گے، ممکن ہے دو چار انوار یہاں بھی مل جائیں، تو نور کی جمع نہ صرف یہ کہ موجود ہے، بلکہ غیر فصیح بھی نہیں ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں نور ایک ہی ہے، اور ظلمات کا کوئی حساب و شمار نہیں، ظلمات ایک کروڑ بھی ہو سکتی ہیں، لیکن نور ایک ہوگا: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَالَهُ مِنْ نُورٍ﴾ [سورۃ النور: ۴۰] جس کے لیے اللہ کی جانب سے نور نہ ملے، اس کے لیے نور کا کوئی اور ذریعہ اور سرچشمہ نہیں، جس مذہب کی اور دین کی فطرت یہ ہے کہ اس پر اس کو اصرار ہے کہ تنہا وہی حق ہے، جس کو اس پر اصرار ہے کہ نور و ایمان کے حدود معین ہیں، اس کو اس پر اصرار ہے کہ اسلام ایک تمدن بھی رکھتا ہے، خالی عقائد کا نام نہیں ہے، جب مغربی تہذیب اپنے پورے تصورات کے ساتھ، اپنے پورے اقدار حیات کے ساتھ، پورے مقاصد کے ساتھ آئی تو اس کا اس سے ٹکراؤ لازمی تھا، ٹکراؤ ہوا اور خوب ہوا۔

مغربی تعلیم کی زہرناکی

پھر اس کے بعد ایک دوسرا سانحہ پیش آیا کہ اس ملک و قوم کے ذہن، کھاتے پیتے گھرانے کے نوجوانوں نے مغربی تعلیم حاصل کی، اور عوام اپنی اسی حالت پر رہے، وہ اسی

ورثہ کو اپنے سینے سے لگائے رہے، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ عوام کے تصورات اور عوام کے احساسات و جذبات سے اتنا بیگانہ بن گیا کہ جیسے ایک نئی قوم پیدا ہوتی ہے، یعنی دونی قومیں پیدا ہو گئیں، اور دوسری مصیبت یہ پیش آئی کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے محسوس کیا اور تجربوں کے بعد اس کو یہ معلوم ہوا کہ اگر وہ زندگی چاہتا ہے، قیادت باقی رکھنا چاہتا ہے، تو ضروری ہے کہ عوام کے اس دینی جذبہ کو اتنا فنا کر دے یا اتنا کمزور کر دے کہ وہ اس کے راستہ میں مزاحم نہ ہو، نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے تعلیم کے ذریعہ، ابلاغ کے ذرائع کے ذریعہ، صحافت کے ذریعہ، ادب و لٹریچر کے ذریعہ، یہاں تک کہ شاعری کے ذریعہ، عوام کی اس دینی حمیت کو، اس اسلامی غیرت کو اور ان کی اس ذکاوت حس کو ختم کرنے کی کوشش شروع کر دی، اب مستقل معرکہ پیش آیا ان ملکوں کو کہ انھوں نے دیکھا کہ اگر ہمیں رہنا ہے تو عوام اگر اسی طرح رہے، ان کے یہی احساسات و جذبات رہے، تو کبھی یہ عوام ہمارے خلاف صف آرا ہو سکتے ہیں۔

ترقی یافتہ مسلم ممالک کی المناک کہانی

میں یہ کہانی سنا رہا ہوں آپ کو مصر کی، شام کی، عراق کی، ترکی کی، میں نہیں کہتا کہ یہ ہر ملک کی کہانی ہے، اور خدا کرے اس ملک میں ڈرامہ کبھی اسی طرح نہ ہو، لیکن ہے یہ ترقی یافتہ مسلم ممالک کی کہانی، ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جو اسلام سے نہ صرف یہ کہ بیگانہ تھا، بلکہ اس کو اس سے ایک طرح کا بعد اور وحشت تھی، یہ عوام کا کیا حال ہے، یہ بالکل چھوٹی موٹی بن گئے ہیں، چھوٹی موٹی کو ہاتھ لگایا، اور وہ سمٹ آئی، شرمائی، تو عوام کیا بالکل چھوٹی موٹی ہیں، ان کا عقیدہ اتنا کمزور ہے، ارے بھئی! اگر کچھ لوگ شراب پیتے ہیں، تو پھر اس میں کون سی ایسی مصیبت آئی، اور اگر ٹیلی ویژن پر یہ سب کچھ دکھلایا جاتا ہے، اور اس سے لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق پر اثر پڑتا ہے، تو ایسی کیا قیامت آ جاتی ہے؟ وہ کھائیں پیئیں، دکان اور کاروبار کریں، دولت پیدا کریں، ان کو اس سے کیا تعلق ہے، مذہب تو ایک پرائیویٹ معاملہ ہے، ان کے استادوں نے اور مغرب کی یونیورسٹیوں نے ان کے دل و دماغ میں یہ بات اتار دی ہے کہ مذہب تو ایک شخصی معاملہ ہے، اور مذہب کی بقا بھی اسی میں ہے کہ شخصی معاملہ رہے،

اور اب دنیا اسی طرح چل سکتی ہے کہ مذہب شخصی معاملہ سمجھا جائے، ان کے ذہن نے پہلے سے اس کو قبول کر لیا، اب یہاں وہ آئے، تو دیکھا کہ عوام حکومت کے معاملہ میں دخل دیتے ہیں، تنقید کرتے ہیں، بات بات میں متاثر بلکہ مشتعل ہو جاتے ہیں، انھوں نے ایک نیا محاذ کھول دیا، جمال عبدالناصر کے دور میں مصری عوام کے خلاف مصر کی ساری طاقت اور اس کی مشینری لگ گئی، فوج پولیس بن گئی، مصر کے سارے وسائل و ذخائر اور مصری قوم کی ساری توانائیاں اور جو جماعت برسر حکومت تھی، اس کی ساری ذہانت اس جذبہ کے کچلنے میں لگا دی گئی جو ان کے لیے کسی وقت بھی آگ کی صورت اختیار کر سکتی تھی، جو دور جمال عبدالناصر کی لیڈرشپ کا گزرا، یہ بجائے اسرائیل سے لڑنے کے، بجائے کمیونزم سے لڑنے کے، بجائے الحاد سے لڑنے کے، یہ پُرامن شہریوں سے لڑنے میں صرف ہوا، اور ان دینی اور اسلامی تحریکوں کے ختم کرنے میں خرچ ہوا، اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کے اثرات کہاں تک باقی رہے، یہ کہنا مشکل ہے، لیکن یہی حقیقی جنگ تھی، جو وہاں لڑی گئی، یہی حقیقی جنگ ہے جو شام و عراق اور لیبیا و تونس، الجزائر اور مراکش میں لڑی جا رہی ہے، کہیں گرم، کہیں نرم، میں عرب ملکوں کے علاوہ کسی غیر عرب ملک کا نام نہیں لوں گا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

یہ مصنوعی کارزار پیدا کی ہے ان دو فلسفوں نے، ان دو متوازی نظام تعلیم نے، ہمارے مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے، وہ تو قال اللہ وقال الرسول کی تعلیم ہے، اور یہاں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ اس کی نفی کی تعلیم ہے، جب انگریزی دور اقتدار (غیر منقسم) ہندوستان میں آیا اور انگریزوں کا نظام تعلیم آیا تو اکبر نے وہ شعر کہا جس سے بہتر شعر آج تک جدید لادینی نظام تعلیم اور اس کے دور رس نتائج کے متعلق کسی نے نہیں کہا ہے، مغربی نظام تعلیم کے اثرات کے بارے میں اس سے زیادہ سادے الفاظ میں، اس سے زیادہ گہری حقیقت نہیں بیان کی گئی:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

انسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوچھی

انھوں نے اس حقیقت کو بیان کیا کہ فرعون نے اپنی غباوت اور کند ذہنی سے خواہ مخواہ اپنے خلاف اتنا پروپیگنڈہ کرایا، اور اپنے لیے اتنی مشکلات پیدا کیں کہ آج تک صحف سماوی تک میں وہ علامت ہے جبر و استبداد کی، وہ نظام تعلیم بدل دیتا، تو بجائے بدنامی کے نیک نامی ہوتی، بجائے اس کو جہالت کی ایک علامت سمجھ لینے کے علم کا سر پرست مانا جاتا، مرئی مانا جاتا، اس کے نام سے کتنی یونیورسٹیاں قائم ہوتیں، کتنی اکاڈمیاں قائم ہوتیں، سعودی عرب میں بھی مغربی نظام تعلیم سے اب یہ کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔

ہر ایسے ملک کو جس کو اسلام کی خدمت کرنی ہے، اور جس کو اسلام کا جھنڈا بلند کرنا ہے، اپنے ملک کو اس ذہنی کشمکش سے بچانا چاہیے، اس لیے کہ اس ذہنی کشمکش کے شروع ہو جانے کے بعد پھر وہ ساری ذہانتیں اور قوت عمل وہ سب کی سب اس میں لگ جاتی ہیں، ملک کی تعمیر میں، ملک کو مستحکم کرنے میں، سالمیت کی حفاظت میں جو توانائیاں صرف ہونی چاہئیں، اس میں صرف ہوتی ہیں کہ کون جیتے، کون ہارے، کس کا فلسفہ اخلاق، فلسفہ مابعد الطبیعیات، کس کا فلسفہ حیات غالب اور کارفرما رہے۔

میں اس جامعہ سے توقع کرتا ہوں کہ دوسری جامعات کے مقابلہ میں یہ اصلاحی قدم پہلے اٹھائے گی، اس لیے کہ جس مفکر اسلام سے اس کو نسبت ہے، وہ موجودہ نظام تعلیم سے غیر مطمئن تھا، وہ اسلامی ملکوں میں اس نظام تعلیم کے نافذ ہونے سے ہراساں اور ترساں رہتا تھا، وہ اگر زندہ ہوتے تو شاید مطالبہ اس کا کرتے کہ سب سے پہلے نظام تعلیم بدلا جائے، اس لیے کہ انھوں نے کہا ہے کہ یہ وہ تیزاب ہے جس میں انسان کی خودی کو ڈال کر بالکل تحلیل کر دیا جاتا ہے:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو ہو جائے ملامت تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب سونے کا ہالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

عمان میں ایک مکالمہ تھا،^(۱) استاذ کامل الشریف جو آج کل وہاں وزیر اوقاف ہیں، وہ، میں اور سعودی عرب کے ایک فاضل شیخ احمد جمال، تینوں سے سوال کیے جا رہے تھے، یہ مکالمہ

(۱) پورے مکالمہ کے لیے دیکھیے: ”دریائے کابل سے دریائے یرموک تک“ مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، کھنؤ، طبع ۲۰۰۳ء، صفحہ ۲۶۵ تا ۲۶۸۔

ریڈیو پر بھی نشر ہوتا تھا، مجھ سے کہا گیا: اس وقت کی سب سے بڑی مصیبت خصوصاً نوجوانوں کی پریشانی کا اصل سبب کیا ہے؟ میں نے کہا: زندگی کا تضاد، وہ بیک وقت اتنی متضاد چیزیں دیکھتے ہیں، گھر کا نقشہ کچھ دیکھتے ہیں، باپ دادا کی روایت کچھ سنتے ہیں، اسکول یا کالج جا کر کچھ سنتے ہیں، ادب پڑھتے ہیں اور لٹریچر دیکھتے ہیں تو اس میں کچھ اور دعوت پاتے ہیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر وہ تفریح حاصل کرتے ہیں، وہ ان کو کچھ اور دیتا ہے، اس نے ایسا کنفیوژن (Confusion) پیدا کر دیا ہے، ایک ایسا دماغی تضاد اور انتشار پیدا کر دیا ہے کہ فیصلہ نہیں کر پاتے، جب تک یہ حالت ہے کہ ایک گاڑی میں دو گھوڑے جتے ہوئے ہیں، ایک مشرق کی طرف لے جا رہا ہے، ایک مغرب کی طرف لے جا رہا ہے، اس گاڑی اور گاڑی پر بیٹھنے والے مسافر کا اللہ ہی حافظ ہے، یہ تضاد سوسائٹی سے، ہمارے نظام تعلیم سے ختم ہونا چاہیے۔

میں ان الفاظ کے ساتھ اپنی گزارشات کو ختم کرتا ہوں، اور میں وائس چانسلر صاحب کا، جسٹس افضل چیمہ صاحب کا شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے سفارش کی اور میں یہاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں سمجھتا ہوں کہ میرے یہ الفاظ آپ کو یاد نہ رہیں، لیکن کم سے کم اقبال کا پیام تو آپ کو یاد رہے گا، اب میں اقبال ہی کے اشعار پر ختم کرنا چاہتا ہوں:

اے پیر حرم! رسم و رہ خانگی چھوڑ	مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت	دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے	مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی	دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا (۱)

(۱) ”دعوت فکر و عمل“ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، شائع کردہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۹۹ء، (ص ۱۲۵-۱۳۶)۔

اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت اور وہاں کی قیادت اور فکری رجحانات میں اس کے دور رس اثرات^(۱)

امت مسلمہ اور عالم اسلام کی موت وزیست کا مسئلہ

بزرگان محترم اور رفقاء کرام!

میں اس فرصت اور صحبت کو جو زمانہ طویل کے بعد میسر آئی ہے، غنیمت سمجھتے ہوئے اور اس سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے آج ایک ایسے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک امت مسلمہ اور عالم اسلام کی موت وزیست اور وجود اور عدم وجود کے مرادف ہے، میں پوری دیانتداری اور یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ بین الاقوامی اسلامی اجتماع اس اہم اور نازک موضوع پر گہرائی، ہمدردی اور سنجیدگی سے غور کرتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی نتیجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو ہم اس کو ایک مبارک اور تاریخ ساز اجتماع کہہ سکتے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی تو وہ ملت اسلامی کی حیات نو کا نقطہ آغاز بن سکتا ہے۔

حضرات! آپ حضرات کی اجازت سے میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل اور وضاحت و صراحت کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں، موضوع کی نزاکت اور اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ کہانی بہت دور سے شروع کی جائے، اس لیے کہ یہ مسئلہ آج کا یا چند مہینوں اور

(۱) ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے پچاسی سالہ جشنِ تعلیمی کے موقع پر یکم نومبر ۱۹۷۵ء کو پڑھا گیا مضمون۔

سالوں کا نہیں ہے، یہ ایک بہت قدیم مسئلہ اور پرانی مشکل ہے، جس کی جڑیں ملت کی زندگی اور تاریخ میں اندر تک پیوست اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

ایک نفسیاتی حقیقت

اس سلسلہ میں پہلی نفسیاتی حقیقت جس سے صرف نظر کرنا ناممکن ہے، وہ اسلامی معاشرہ میں ایسے اشخاص کا وجود ہے جن کو اس عقیدہ پر (جس پر اس معاشرہ کی اساس ہے) قلبی طور پر انشراح نہیں ہوتا، اور وہ ان حقائق و مبادی اور مقاصد اور اقدار پر یقین نہیں رکھتے جن کے لیے یہ معاشرہ زندہ اور کوشاں ہے۔

یہ دراصل ہر اس انسانی معاشرہ کا مزاج اور خاصہ ہے جو کسی مخصوص عقیدہ اور متعین حدود و قیود کا پابند ہے، اور جب اس معاشرہ اور جماعت کا کوئی فرد ان حدود کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اس کے دائرہ سے خارج یا اس کا باغی قرار دیا جاتا ہے، اور ان حقوق و امتیازات سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جو اس کو اب تک حاصل تھے، برخلاف قومیتوں کے جن کا دروازہ ہر عقیدہ و مسلک اور ہر قسم کے صحیح اور غلط طرز زندگی اور کردار کے لیے کھلا رہتا ہے، اور ان کی صرف ایک شرط ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ یہ فرد اپنی قومیت تبدیل نہ کرے، حکومت یا ملک کے خلاف کوئی سازش نہ کرے، اور کسی قومی غداری کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔

یہ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، اور جن لوگوں پر اس معاشرہ کے اچھے برے کی ذمہ داری ہے، ان کے لیے سب سے سنگین مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ عنصر (جس نے اس عقیدہ کو کبھی اخلاص کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا یا کسی وجہ سے اس کو ہضم نہیں کر سکا تھا، یا کسی خاص سبب سے ہضم کرنے کے بعد اسے پھر خارج کر دیا تھا) اس مومن و مسلم معاشرہ کے دائرہ اور فریم کے اندر اس کے ایک جزو کی حیثیت سے زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا چاہتا ہے، اور اپنے مستقبل کو کسی خاص مصلحت یا مجبوری سے اس کے مستقبل کے ساتھ وابستہ کرتا ہے، لیکن بایں ہمہ اپنے کو اس کے مطابق ڈھالنا، اس کے رنگ میں رنگنا اس کو کسی حالت میں گوارا نہیں ہوتا، وہ اس معاشرے کے مسلم و بنیادی حقائق اور تصورات اور صفات و خصوصیات پر

یقین نہیں رکھتا اور نہ اس کے اندر اس کے لیے کوئی گرم جوشی اور اخلاص پایا جاتا ہے، غور سے دیکھا جائے تو یہ بات فتنہ ارتداد سے زیادہ خطرناک، فتنہ انگیز اور دور رس ہے، جس کی سنگینی سے ہمارا مسلم معاشرہ واقف ہے۔

نفسیاتی کشمکش

یہ مسئلہ اس وقت کچھ اور پیچیدہ بن جاتا ہے جب یہ عنصر اپنی ذہانت و ہنرمندی سے، نیز عوامی اعتماد حاصل کرنے اور دوسروں پر چھا جانے کی وجہ سے زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے، اور پھر اس کے بعد پورے معاشرہ کو اس راستے پر لے جاتا ہے جو اس کے نزدیک الحاد و بے دینی اور اس کے طے شدہ اصولوں اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کے راستے ہیں، بعض اوقات اس کو ان مقاصد کی طرف بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکایا جاتا ہے، جو اس کے دین و عقیدہ کے سراسر منافی یا اس کے متوازی ہوتے ہیں، وہ ایک ایسی عمیق نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے جس سے زیادہ سخت کشمکش تاریخ انسانی، تاریخ اخلاق و نفسیات اور تاریخ مذاہب میں شاید ہی کبھی پیش آئی ہو، وہ موت و زیست کی درمیانی اور بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس سے اس کو کسی وقت چھٹکارا نہیں ملتا۔

فکری و ذہنی ارتداد

اس قیادت کے اثر سے جو اپنے معاشرہ اور قوم کے دین و عقیدہ پر ایمان نہیں رکھتی، بلکہ اکثر اوقات اس سے برسہا برسہا اور آ مادہ فساد رہتی ہے، فکری و ذہنی ارتداد کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے، اور ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد جن کے پاس اخلاقی و نفسیاتی حفاظت کا کوئی سامان یا ایمانی و روحانی قوت کا کوئی ذخیرہ یا کوئی علمی و فکری حصار نہیں ہوتا، اس سمندر میں غرقاب ہو جاتی ہے، دولت کے پرستار، چڑھتے سورج کے پجاری، موقع پرست، ابن الوقت اس کا خصوصیت سے اور زیادہ آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں یا پھر دوسری شکل میں نفاق پورے معاشرہ میں عام ہو جاتا ہے، معاشرہ کی داخلی قوت ختم ہو جاتی ہے، اور اس کا پورا ڈھانچہ اندر اندر سڑنے لگتا

ہے، مکرو فریب عام ہوتا ہے، سازشوں کی کثرت ہوتی ہے، غداری اور قومی خیانت کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں، ضمیر اور بڑی سے بڑی قابل احترام اور مقدس میراث کا سودا اُرزال اور آسان ہوتا ہے، ملک کے بڑے بڑے رقبے چند سکوں کے عوض فروخت کر دیے جاتے ہیں، جاسوسوں اور دشمن کے کارندوں اور ایجنٹوں کی بن آتی ہے، اور ان کو اس خدمت کے لیے کوئی بھی طریقہ اور حربہ استعمال کرنے سے دریغ نہیں ہوتا، یہ وہ صورت ہے جس کی نظیر کسی اور انسانی معاشرہ میں (جس کو یہ سخت آزمائش پیش نہیں آئی ہے یا جس کے عوام اور قیادت کے درمیان اتنی وسیع، گہری اور بنیادی و نظریاتی خلیج نہیں ہے) نہیں ملتی۔

حالات و واقعات کا منطقی نتیجہ

اس کے نتیجے میں یہ معاشرہ کسی بیرونی دشمن یا اندرونی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا، اور اس کی اصل وجہ یہی ذہنی انتشار اور نفسیاتی کشمکش، قیادت اور اس کے دیے ہوئے اعلانات اور نعروں سے عوام کی بے تعلقی اور عدم دلچسپی ہے، یہ سب حالات و واقعات کا منطقی نتیجہ اور نفسیات انسانی کا طبعی خاصہ ہے، اور ان تمام ملکوں کی قدیم و جدید تاریخ اس پر گواہ ہے، جو اپنے قائدین و زعماء یا اپنے حکام و امراء کی محبت سے کبھی آشنا نہیں رہے، اور جہاں جمہور اور قیادت میں جذباتی ہم آہنگی اور فکری یکسانیت کبھی پیدا نہیں ہو سکی۔

اسلامی سوسائٹی اور نفاق

البتہ اس اسلامی سوسائٹی نے۔ جو خود دعوت اسلامی کی اساس پر قائم تھی اور جس نے نبوت محمدی کی آغوش تربیت میں پرورش پائی تھی۔ اس طبعی اور تاریخی حقیقت اور امر واقعی کا کامیابی سے مقابلہ کیا جس کا واسطہ قدرتی طور پر ہر اس جماعت کو پڑتا ہے جس کی تعمیر ایمان و عقیدہ، دیانت و تقویٰ اور دعوت و جہاد کی بنیادوں پر ہوئی ہو، نفاق کی بیماری تو صرف اس ماحول کو لگتی ہے جہاں دو حریف نظریات اور مقابل قیادتیں پائی جاتی ہوں، خواہ ان دونوں میں ضعف و قوت اور قلت و کثرت کے لحاظ سے کوئی تناسب نہ ہو، اس موقع پر وہ متردد عنصر سامنے

آتا ہے جو ان دونوں مخالف کیمپوں کے درمیان گھومتا رہتا ہے اور متر و درہتا ہے کہ ان میں سے کس کا انتخاب کیا جائے اور کس کا دامن تھاما جائے؟ پھر کسی نہ کسی دعوت کی طرف مائل ہو کر اس میں شامل ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی محبت و تعلق کا مرکز بنا لیتا ہے، تاہم اس کی مادی مصلحتیں اور حریف کی قوت اور عروج و اقبال اس کو اپنے موقف کے اعلان، اپنی رائے کے اظہار اور نئی دعوت کو بالکل قبول کرنے سے باز رکھتا ہے، اور مقابل دعوت سے اپنی رسم و راہ قطعی اور آخری طور پر ختم نہیں کرتا، قرآن مجید میں اسی کیفیت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:

﴿مُذَبِّذِينَ بَيْنَ ذَلِكَ لَا إِلَىٰ هَؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هَؤُلَاءِ﴾ (سورۃ النساء: ۴۳)

”بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں، نہ ان کی طرف (ہوتے ہیں) نہ ان کی طرف۔“

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّعْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ

أَصْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ﴾ (سورۃ الحج: ۱۱)

”لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کنارے پر (کھڑے ہو کر) خدا کی عبادت کرتے

ہیں، اگر ان کو کوئی دنیاوی فائدہ پہنچے تو اس کے سبب مطمئن ہو جائیں، اور اگر کوئی آفت آپڑے تو منہ کے بل لوٹ جائیں (یعنی پھر کافر ہو جائیں)۔“

اسی لیے جیسا کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ مکہ میں نفاق کا وجود نہ تھا، اور اس کی وجہ یہ

تھی کہ اسلام وہاں مغلوب تھا، اس کے اندر نفع و نقصان پہنچانے اور تغیر و تبدل کی کوئی طاقت

نہ تھی، اور وہاں دو متوازی قوتیں نہ تھیں، مشرکین بڑے طاقتور اور غالب تھے، مسلمان مظلوم،

نہتے اور مغلوب تھے، جب اسلام مکہ سے مدینہ منتقل ہوا اور اسلامی سوسائٹی اپنے تمام

لوازمات اور طبعی خاصیتوں کے ساتھ وجود میں آئی تو نفاق نے سراٹھایا، یہ ایک ایسی قدرتی

اور نفسیاتی صورت حال تھی جس سے کوئی مفر نہ تھا۔

منافقین کو تسلط کیوں کر حاصل ہوا؟

لیکن رسول اللہ ﷺ کے تشریف فرما ہونے اور سلسلہ وحی کی وجہ سے ریوزائیدہ سوسائٹی

ان منافقین کے ضرر سے محفوظ رہی، قرآن مجید نے متعدد جگہوں پر ان کو اچھی طرح بے نقاب

کیا ہے، عام مسلمان بھی ان سے واقف اور بیزار و متنفر تھے، سوسائٹی نے بھی ان کو اپنے دائرہ سے خارج کر دیا تھا، اور ان کے لیے اس کے اندر چوری چھپے گھسنے اور خلل اندازی کرنے کا زیادہ موقع باقی نہیں رہا تھا، سوسائٹی کے اعتماد کو حاصل کرنے اور منصب و اقتدار تک پہنچنے کی بات تو بہت دور کی تھی، چنانچہ یہ اولین اسلامی سوسائٹی برابر صحت مند اور ان آلائشوں سے محفوظ رہی، نفاق اس کو کمزور اور کم خوردہ نہ بنا سکا، اور منافقین کو بھی اس کو نقصان پہنچانے کا موقع نہ مل سکا، بلکہ ان کی کمزوری، شکست خوردگی اور بد حالی کو دیکھ کر بہت سے صحابہ کو۔ جن میں بڑے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ان کی نسل ختم ہو چکی ہے، اور عہد نبوی کے بعد اب نفاق کا کوئی وجود نہیں رہا، لیکن نفاق پہلے بھی انسانی زندگی کا ایک خاصہ اور بہت سے لوگوں کی کمزوری تھا، اور آج بھی ہے، اس نے کسی وقت قافلہ انسانی کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے، اور ہر موقع اور گنجائش سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی جگہ بنائی ہے، بہت سے اسباب و عوامل نے (جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں) اس کی ہمت افزائی کی اور اس کو تخت سلطنت، حربی قوت اور انتظام حکومت کی منزل تک پہنچایا، نیز علم و ادب کی محفلوں میں اس کو باریابی کا موقع دیا، اور یہ سب اس عہد میں ہوا جب اسلام پیش قدمی کر رہا تھا، فاتح و با اقتدار تھا، اور اسلام قبول کرنے اور اسلامیت کا مظاہرہ کرنے میں بہت سے سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی فوائد بھی تھے، یہ وہ موقع تھا جب نفاق نے آگے بڑھ کر وسیع اسلامی سلطنت کے کلیدی اور اہم عہدوں پر قبضہ کر لیا، اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے کسی خاص فن یا صنعت میں اپنی مہارت کی وجہ سے یا غیر معمولی ذہانت یا علمی برتری کی وجہ سے نوازائیدہ اسلامی حکومت پر پورا تسلط حاصل کر لیا، اور ان میں بڑے اعلیٰ درجے کی انتظامی صلاحیتوں کے لوگ، افواج کے سپہ سالار اور ارباب و اہل قلم اور حکومت کے اہل کار پیدا ہوئے۔

حضرت حسن بصریؒ کا تجزیہ

ان حالات میں ایک مرتبہ سیدنا حسن بصری (رحمۃ اللہ علیہ) سے نفاق اور منافقین کی موجودگی کے بارے میں سوال کیا گیا، درانحالیکہ اقتدار اسلام اور مسلمانوں کے ہاتھ میں

ہے، انھوں نے اثبات میں اس کا جواب دیا اور صرف ان کے وجود کی تصدیق نہیں کی بلکہ اس کا اظہار کیا کہ وہ طاقت کی پوزیشن میں ہیں، ان میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت! کیا آج بھی نفاق کا کہیں وجود ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ”اگر منافقین بصرہ کی گلیوں کو چھوڑ دیں تو تم کو ویرانی کی وجہ سے وحشت ہونے لگے۔“ ایک مرتبہ فرمایا: ”اگر وہ نکل جائیں تو تم اپنے دشمنوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکو۔“ ایک موقع پر کہا: ”خدا کی شان! اس امت کو منافقین نے کتنا نقصان پہنچایا اور کس طرح اس پر قبضہ کر لیا۔“ (۱)

مغرب کی فکری و تہذیبی یلغار

اس کے بعد غیر ملکی اقتدار اور مغرب کی فکری و تہذیبی یلغار کا دور شروع ہوتا ہے، اور مشرق اپنے ارادہ سے یا بلا ارادہ مغربی طرز تربیت، نظام تعلیم، دیستان فکر، زندگی اور انسان کے مغربی تصور اور علوم و فنون کے مغربی زاویہ نگاہ کے سایہ میں یا زیادہ بہتر الفاظ میں اس کی گود میں اس طرح آجاتا ہے جیسے کوئی شیر خوار بچہ کسی دیرینہ سال مرئی و اتالیق کی آغوش میں چلا جاتا ہے، وہ اس کے پورے نظام تعلیم یا مختصر الفاظ میں اس کے نظریہ تعلیم کو ساری خرابیوں اور خامیوں کے باوجود جوں کا توں قبول کر لیتا ہے، جو ایک ایسی سر زمین میں پیدا ہوا اور نافذ کیا گیا جس کے عقائد، بنیادی اصول، اخلاقی قدریں، اسلامی معاشرہ کی قدروں اور بنیادی و مسلمہ اصولوں سے ہر جگہ اور ہر سطح پر مختلف ہیں، جن پر وہ پورا ایمان رکھتا ہے، یا ان پر ایمان لانا، ان کے لیے جدوجہد کرنا، ان کے کچھ نہ کچھ قربانی دینا اپنے لیے ضروری سمجھتا ہے، بلکہ مغرب کی اخلاقی قدروں کی تردید اور ان کی بیخ کنی اور تحقیر ہی پر اس کی بنیاد ہے، ایسی حالت میں اس کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہوتی ہے جو آب حیات کے شوق میں زہر کا پیالہ پینا چاہے یا کھارے اور نمکین پانی سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرے۔

انھوں نے اپنے تعلیمی منصوبوں اور علمی اداروں کی تشکیل میں بیرونی ملکوں کے تعلیمی مشیروں کو پورا اختیار دے رکھا ہے، اور ان ملکوں سے صرف درسی کتابیں نہیں برآمد کر رہے

(۱) یہ اقتباسات محدث ابو بکر کی کتاب ”صفۃ النفاق و ذم المنافقین“ (ص: ۶۸) سے ماخوذ ہیں۔ (ج)

ہیں، وہ ان ملکوں میں اپنے تعلیمی فوڈ بھیجتے ہیں تاکہ وہ مغربی ماہرین تعلیم اور اساتذہ کی تربیت میں نشوونما حاصل کریں، پھر ان کو ممالک اسلامیہ کے تعلیمی منصوبوں اور پالیسیوں کی تشکیل و تربیت کی پوری آزادی بھی دے دیتے ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کا نقشہ بنائیں اور ان کا جو رُخ چاہیں متعین کریں۔

اس کے نتیجے میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو اپنے عقائد و افکار اور اپنے اخلاق و سیرت، سب میں ذہنی انتشار کا شکار ہے، فکر مغربی اور فکر اسلامی کے درمیان تذبذب کی حالت بھی بساغیمت تھی، لیکن اس نے اکثر اوقات اپنے ملک و ملت اور اپنے معاشرہ کے سارے معتقدات و مسلمات اور اصول و اقدار سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

فکری اضطراب

یہ ایک بالکل قدرتی بات تھی جس پر کوئی تعجب نہ کرنا چاہیے، بلکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو مقام تعجب تھا، ہو سکتا ہے کہ یہ ماہرین اور مشیران تعلیم اور ان کے شاگرد اپنے کام میں مخلص ہوں، اور اس تعلیمی پالیسی اور منصوبہ بندی میں ان کے پیش نظر اسلامی ملکوں اور نئی نسلوں کی فلاح و ترقی ہو، لیکن یہ فرض کر لینے سے بھی ان ملکوں میں پیدا ہونے والے فکری اضطراب اور بنیادی تضاد اور ناہمواری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اور تصویر اسی طرح تاریک رہتی ہے، ان میں سے اکثر لوگوں کی اس خامی کو اس پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے کہ وہ دین سے اور اس کی بنیادوں اور اصولوں سے، مسلم اقوام کے مزاج و کردار اور ان کی شخصیت و دعوت کے مطابق اور منافی دونوں چیزوں سے واقف نہیں ہوتے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ ان ملکوں اور قوموں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہوں، لیکن ان کو بچانے کی یہی کوشش ان کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتی ہے، ان غیر ملکی تعلیمی مشیروں کے سلسلہ میں مجھے Don Adams کا یہ تبصرہ بہت پسند آیا جو اس نے اپنی کتاب Educational Patterns In Contemporary Societies میں کیا ہے:

”ایک مشرقی حکایت غیر محتاط غیر ملکی تعلیمی مشیروں سے سرزد

ہونے والی غلطیوں کی پوری تصویر کشی کرتی ہے، کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا، جس میں ایک بندر اور ایک مچھلی پھنس گئے، بندر تیز طرار اور تجربہ کار تھا، لہذا ایک درخت پر چڑھ کر وہ سیلاب کی طوفانی موجوں سے محفوظ مقام پر جا بیٹھا، اب اس نے نیچے نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ غریب مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے، پوری ہمدردی اور نیک نیتی کے جذبہ کے ساتھ وہ نیچے آیا اور اس نے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا، پھر جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے۔“ (۱)

تعلیم کوئی تجارتی سامان نہیں

عہد حاضر کے ماہرین تعلیم نے بالاتفاق اس کا اظہار کیا ہے کہ: ”تعلیم کوئی ایسا تجارتی سامان نہیں ہے جو درآمد یا برآمد کیا جاسکے، مثلاً مصنوعات، کچا مال یا وہ ایجادات و ضروریات جو کسی ملک اور علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں، وہ ایسا لباس ہے جو ان اقوام کے قد و قامت و جسامت کی ٹھیک ناپ کے مطابق تراشا اور سیا جاتا ہے، اور پسندیدہ و محبوب علم و فن اور ان مقاصد کو سامنے رکھ کر تیار کیا جاتا ہے جن کے لیے وہ ہر طرح کی قربانی دے سکتی ہیں۔“ (۲)

اور یہ کہ

”تعلیم صرف اس عقیدہ کو مضبوط کرنے کا ایک مہذب اور شائستہ طریقہ ہے، جس کا حامل یہ ملک یا قوم ہے، اس کا مقصد فکری طور پر اس کو غذا دینا، اس پر اعتماد کرنا اور اگر ضرورت ہو تو علمی دلائل سے اس کو مسلح

I.N.Thut And Don Adams: "Educational Patterns In Contemporary (۱)
(۲) Societies", McGraw Hill Book Co. New York, Page:352

(۲) نحو التربية الإسلامية الحرة. (ج)

کرنا ہے، وہ اس عقیدہ کے دوام و بقا کا وسیلہ اور بے کم و کاست آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا ایک طریقہ ہے، نظام تعلیم کی بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ والدین اور مربیوں اور نگرانوں کی اس سعی پیہم کا نام ہے جو وہ اپنی اولاد کو اپنے دین و مسلک پر قائم رکھنے کے لیے کرتے رہتے ہیں، اور ان کی اس طرح تربیت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ورثہ کے (جو انھوں نے اپنے آباء و اجداد سے حاصل کیا تھا) صالح و اہل وارث اور امین ثابت ہوں، اور ان کے اندر اس ثروت میں اضافہ اور توسیع اور اس کو ترقی دینے کی پوری صلاحیت ہو۔“ (۱)

برطانیہ کے ماہرین تعلیم کی ایک رپورٹ میں یہی بات کہی گئی ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

”ریاست کا مفاد اس میں ہے کہ وہ دیکھے کہ اسکولوں کے ذریعہ قومی زندگی کے مکمل اجزاء نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے ہیں، اس کا کام ہے کہ یہ دیکھے کہ طلبہ قومی مفاد کے مقررہ معیار کی کارکردگی کو قائم رکھتے ہیں اور اسے ترقی دیتے ہیں، ریاست کی ظاہری تعلیمی سرگرمی کے پس پشت غیر مرتب لیکن معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ بچے قومی اور آبائی خصوصیات کے جانشین بنتے ہیں۔“ (۲)

F.W.Gard Ford نے اپنی کتاب Education & Social Purpose

میں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”اولین طور پر تعلیم کے مقصد کو سماج کی روایات اور اس کے

(۱) اس کی تائید میں ملاحظہ ہو: مشہور ماہر تعلیم جان ڈیوی (John Dewey) کی فن تعلیم پر تصنیفات اور

تحریریں نیز مقالہ: "Education" مندرجہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ (ج)

(۲) Secondary Education with Special Reference to Grammer and

(ج) - Technical Schools, H.M.S.O. 1931, pp 147-148

موجودہ اقدار پر پرکھنا چاہیے، کیونکہ یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر اس کی خصوصیات اور بقا منحصر ہے، اور یہ بے حد ضروری ہے کہ ان دونوں کے درمیان دفعتاً کوئی بے ربطی نہ پیدا ہو، اس کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ترقی کی ہر کوشش سماج کے مسلم اقدار کی بنیاد پر ہو۔“ (۱)

ایک اور ماہر تعلیم Vernon Mallinson کی شہادت میں اس سے زیادہ یقین اور صراحت سے کام لیا گیا ہے، وہ لکھتا ہے:

”ایک قسم کا ذہنی منشور جو پورے معاشرہ کے مشترکہ مقصد اور مشترکہ کوششوں کا آئینہ دار ہوتا ہے، ایک طرح یہ بڑے پیمانہ پر قومی جذبہ کی عکاسی کرتا ہے، اور ان خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے جو معاشرہ کے نصب العین کی خوبی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔“ (۲)

مغرب کا طریقہ کار

مغرب اپنے سیاسی نظاموں اور مکاتب خیال کے اختلاف، نیز اپنے مشرقی و مغربی کیمپوں اور اپنی ساری قومی بیماریوں اور نقائص اور خامیوں کے باوجود اس تعلیمی پالیسی پر پوری طرح کار بند ہے، اور تعلیم و تربیت کے تمام شعبوں میں اس نے اس کو تمام وکمال نافذ کر رکھا ہے، اور اس کے تمام تعلیمی پروگرام اور تعلیمی پالیسیاں اسی مقرر کردہ اصول کی تابع ہیں۔

سوویت یونین بھی جو انقلابی ذہن اور اپنی انتہا پسندی میں مشہور ہے، اس اصول کو نافذ اور جاری کرنے میں سرمایہ دارانہ جمہوری حکومتوں سے پیچھے نہیں رہا، بلکہ شاید اپنے اشتراکی نظریہ کی حفاظت اور انقلابی روح کی بنا پر اس اصول کو عملی جامہ پہنانے میں وہ ان ممالک سے بھی آگے ہے، ایک سرکاری حکم نامہ مگر یہ ۱۲ نومبر ۱۹۰۸ء میں یہ کہا گیا ہے کہ:

F.W.Gard Ford: Education & Social Purpose, London, (1962) (۱)

(ح)-Page: 46-47

An Introduction to The Study Of Comparative (۲)

(ح)-Education, London, 1957, Page 4

”ان خصوصیات کے حصول میں سماجی علوم (Social Sciences) کی تعلیم ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، مارکسزم، لینن ازم کا علم ہر فن کے ماہرین کے لیے اشد ضروری ہے، ہمارے نوجوانوں کی تربیت اس طرح ہونی چاہیے کہ ان میں بورژوا نصب العین اور احیاء پرستی کے خلاف تعصب کی روح سرایت کر جائے۔“^(۱)

مغرب اس نقصان سے محفوظ کیوں؟

یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے مغرب اس نقصان سے محفوظ رہا جس کا شکار مشرق کے اسلامی وغیر اسلامی ممالک سب ہیں، چنانچہ آج مغرب میں عوام اور قیادت یا جمہور اور حکومت میں کسی گہری اور وسیع نظریاتی، ذہنی و فکری خلیج کا سراغ نہیں ملتا، وہاں صرف ایک طرز اور ایک آئیڈیل اور ایک قسم کے اصول و نظریات اور مقاصد اور نصب العین پائے جاتے ہیں، وہاں مختلف طبقات اور سوسائٹی کے افراد کے درمیان کسی قسم کی ذہنی اور نفسیاتی رسد کشی نہیں، اور اسی وجہ سے یہ ممالک اندرونی سازشوں اور بغاوتوں سے محفوظ ہیں۔

مغرب کے بعد ان مشرقی ممالک کا نمبر آتا ہے جو مدت دراز سے اپنا کوئی عقیدہ نہیں رکھتے اور ان کو ان حقائق پر یقین نہیں جن کی ایمان بالغیب اور انبیاء کی تعلیمات و ہدایات پر بنیاد ہے، ان کے پاس متعین آسمانی تعلیمات یا محفوظ آسمانی صحیفے بھی نہیں ہیں، وہ صرف ان قومی روایات اور جماعتی و شخصی مفادات کی حامل ہیں جن کو یہ تعلیمی نظام اور پروگرام چیلنج نہیں کرتے، اور کسی جگہ ان دونوں کا کراس نہیں ہوتا، چنانچہ یہ ممالک بھی اسی طرح اس تضاد سے محفوظ ہیں جو مغربی نظام تعلیم پیدا کرتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انھوں نے اس نظام تعلیم سے صلح و صفائی کر لی ہے اور دونوں میں پوری مفاہمت پائی جاتی ہے، یا انھوں نے اپنے آپ کو ان تعلیمی و تربیتی نظریات کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اسی لیے انقلابات اور سازشوں کا

George S. Counts: The Challenge Of Soviet Education, (۱)

(۱)(McGraw Hill Book Co., New York, 1957, Page 50-51:32)

تناسب یہاں بہت کم اور تضاد بھی بہت کم یا اتنا کمزور ہے کہ قومی زندگی پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، ملک سے غداری اور قومی خیانت کے واقعات شاذ و نادر ہوتے ہیں، اور یہاں بھی عوام اور رہنما طبقہ میں وہ وسیع خلیج حاصل نہیں ہے جو ہمیں اسلامی ملکوں میں نظر آتی ہے، ان ممالک کے امراض اور ان کے عیوب دوسری نوع کے ہیں، اور اس کے اسباب و عوامل بھی بالکل دوسرے ہیں، جن کا تعلق ان کی تاریخ، ان کے قومی مزاج، مخصوص عقائد، دینی حاسہ کی کمزوری، شعور کی کمی اور نظام تعلیم و تربیت کے فساد سے ہے۔

اسلامی ممالک میں کشمکش کیوں؟

جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے، وہاں یہ کشمکش اور عجیب تضاد بڑے وسیع پیمانہ اور مختلف سطح پر پایا جاتا ہے، وہاں ایک طرف حکومت اور جمہور میں کشمکش ہے، دوسری طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں میں رسد کشی ہے، تیسری طرف دیندار اور آزاد خیال اور ترقی پسند افراد دست و گریباں ہیں، اور یہ نتیجہ ہے اس نظام تعلیم کا جو مغربی ملکوں سے درآمد کیا جا رہا ہے، یا مغربی ذہن اور نظام تعلیم کے خطوط پر خود ان ملکوں میں تیار کیا جا رہا ہے، اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسی نسل پیدا ہو رہی ہے جو ان عقائد اور حقائق کو پوری طرح ہضم اور قبول نہیں کر پاتی جن پر اس کے معاشرہ اور اس امت کی بنیاد ہے، اس لیے کہ یہ نظام تعلیم جس طرح کے خیالات کی آبیاری اس کے دل و دماغ میں کرتا ہے وہ ان حقائق اور عقائد سے کھلے طور پر متصادم ہیں جو اس معاشرہ کے لیے ناگزیر ہیں، کبھی خارق عادت طریقہ پر یا کسی بیرونی اثر سے وہ اس کو قبول کرتی ہے تو لازماً اس کے نتیجہ میں یہ نظام تعلیم ضرور کمزور پڑتا اور دبتا ہے، لیکن ایسا بہت شاذ و نادر ہوتا ہے۔

جب یہ طبقہ اس نظام کے آغوش میں تربیت پا کر نکلتا ہے تو قوم کے عقیدہ، خیالات اور جذبات سے اس کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے، اگر وہ قوی الارادہ ہوتا ہے تو وہ رجعت پسندی کے ملبہ کو (جیسا کہ اس طبقہ کے معین افراد یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں) راستہ سے ہٹا کر اپنی قوم و ملک کو ماضی کے بارگراں سے رہائی بخشنا چاہتا ہے، اس موقع پر ایک ایسی طویل

کشکش برپا ہوتی ہے جس پر ملت کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں بے دریغ خرچ ہوتی ہیں، اور اندرونی خانہ جنگیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو بیرونی جنگوں سے بڑھ جاتا ہے، یہ ان ممالک کا قصہ ہے جہاں ایسی قیادتیں برسرِ اقتدار تھیں جو انقلابی، قوم پرستانہ اور لادینی فلسفوں اور دعوتوں پر یقین رکھتی تھی۔

اگر اس طبقہ کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے اور وہ طاقتور شخصیت سے محروم ہوتا ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے، اور اس کے اندر ان عقائد اور مقاصد کی طرف سے دلی نفرت پیدا ہو جاتی ہے، وہ آئے دن اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے، غیر ملکوں اور بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر لیتا ہے، اور عوام کے قومی جذبہ اور دباؤ اور علماء و دعوت دین کے علم برداروں کے اثر و رسوخ سے پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتا ہے، چنانچہ اس کے نتیجے میں غداری کے واقعات بار بار پیش آتے ہیں، اور یہ ممالک مستقل طور پر بے یقینی، خوف و دہشت، ذہنی انتشار اور شبہ و بے اعتمادی کی فضا میں رہتے ہیں۔

از سر نو پورا نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت

اس غیر فطری اور غیر ضروری صورت حال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ اس پورے تعلیمی نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے اور اس کو ختم کر کے نئے سرے سے ایک نیا نظام تعلیم تیار کیا جائے جو اس ملت اور امت کے قد و قامت پر راست آتا ہو اور اس کی دینی و دنیاوی ضروریات پوری کر سکتا ہو۔

یہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ، اس کی سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت، وقت کی آواز اور اسلامیانِ عالم کا سب سے بڑا فرض ہے۔

”اس مسئلہ کا حل خواہ وہ کتنا ہی دشوار نظر آ رہا ہو اور صبر آزما اور وقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو از سر نو ڈھالا جائے اور اس کو امت مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزاء سے مادیت،

خدا سے سرکشی، اخلاقی و روحانی قدروں سے بغاوت اور جسم و خواہشات کی پرستش کی روح اور اسپرٹ کو ختم کیا جائے، اور اس کے بجائے تقویٰ، انابت الی اللہ، آخرت کی اہمیت اور فکر، اور پوری انسانیت پر شفقت کی روح اس میں جاری و ساری کر دی جائے، اس مقصد کے لیے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ اور علم انفس تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات و معاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنی ہوگی، مغرب کے ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا ہوگا، اس کی قیادت و امامت کا انکار کرنا پڑے گا، اس کے علوم و نظریات پر علمی تحلیل و تجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ عمل کرنا ہوگا اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مغرب کی کامیابیوں اور پیش قدمیوں نے انسانیت اور تہذیب کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

اس کے علوم کے ساتھ مواد خام (Raw Materials) کا سامنا کرنا ہوگا، اور اس سے وہ چیزیں تیار کرنی ہوں گی جو ان قوموں اور ملکوں کی اپنی ضروریات، رجحانات اور ان کے عقیدہ و تہذیب سے ہم آہنگ ہوں۔

اس راہ میں اگرچہ بہت سے سنگ گراں ہیں اور نتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہو سکتے ہیں، لیکن یہ تجدید پسندی، آزاد خیالی، اور مغرب کی ذہنی غلامی کی اس طوفانی موج کو روکنے کا واحد طریقہ ہے، جس نے عالم اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کر رکھ دیا ہے، اور اسلام کے فکری اور اجتماعی ڈھانچہ اور ملت ابراہیمی کے شیرازہ کے لیے ایک چیلنج بن گئی ہے، اور جس کے نتیجے میں مسلم اقوام کے پر جوش اسلامی جذبات، ان کی سادہ دلی اور گر مجوشی، ان کی قربانیاں اور سرفروشیوں اور اخلاص و وفا کی قیمتی سوغات (جس کا ان حکومتوں کے قیام اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی میں سب سے بڑا اور براہ راست دخل ہے) افرکتیت اور مغربیت کے تنور کی حقیر ایندھن بن رہی ہے، سادہ لوح، بے زبان، سچے اور مخلص مسلم عوام خاموشی اور سکون کے ساتھ بکریوں کے ریوڑ کی طرح کسی نامعلوم منزل کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں، اور یہ طبقہ ان کی قسمت کا مالک بن گیا ہے۔“ (۱)

عالم اسلام کا سب سے بڑا چیلنج

کیا آج کوئی اسلامی ملک اور کوئی اسلامی حکومت، کوئی بڑی اسلامی یونیورسٹی اس آواز پر لبیک کہہ سکتی ہے، اور اپنی ساری کوشش، توجہات اور ذرائع و وسائل اس اہم تعمیری اور انقلابی نقطہ آغاز پر مرکوز کر سکتی ہے، جو بالآخر عالم اسلام کو اس سب سے بڑے خطرہ اور چیلنج سے، بلکہ مکمل تخریب کے اس عمل سے (جو جاری ہے اور جس سے بڑی عمومی، ہمہ گیر، دور رس قومی تباہی و بربادی ہمیں اقوام و مذہب اور تہذیب و تمدن کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی) بچا سکتی ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (سورة البقرة: ۱۹۵)
 ”اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔“

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ حَسْبِيَ إِمْلَاقٍ﴾ (سورة الإسراء: ۳۱)
 ”اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا۔“

یہ قتل معنوی اس قتل جسمانی سے کسی طرح کم نہیں، اس زود اثر اور مہلک زہر میں جو چشم زدن میں انسان کو موت کی نیند سلا دے اور اس زہر میں جس میں انسان گھٹ گھٹ کر مرے، نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے، اور قرآن مجید نے دونوں سے منع کیا ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾ [سورة النساء: ۲۹]
 ”اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، کچھ شک نہیں کہ خدا تم پر مہربان ہے۔“ (۱)

(۱) یہ مضمون علاحدہ رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔

نظام تعلیم و تربیت کا معاشرہ

اور

اس کے رجحانات سے گہرا تعلق ہے^(۱)

تعلیم کی کامیابی و ناکامی

مشرق و مغرب کے جدید و قدیم بہت سے ایسے ماہرین تعلیم و تربیت ہیں جو تعلیمی مسئلہ کو زندگی اور معاشرہ سے الگ رکھ کر زیر بحث لاتے ہیں، جیسے ان کا تعلق ایک عارضی اور وقتی تعلق ہو، یا وہ کوئی پل ہے جس کے ذریعہ کوئی انسان دریا پار کر کے پھر اپنی تمام کیفیات و عادات کے ساتھ اپنے گھر واپس آجاتا ہے، چنانچہ وہ تعلیم کی کامیابی و ناکامی کا اندازہ تعلیم یافتہ فرد کی معلومات، امتحان میں حاصل کردہ نمبر، ڈگریوں، چرب زبانی اور خوش لباسی سے کرتے ہیں، اور عملی و معاشرتی معیاروں اور پیمانوں سے اس کی کامیابی کی جانچ پڑتال نہیں کرتے، بہت سے تعلیم کے دلدادہ افراد کسی ملک کی ترقی، بیداری اور اس کے ثقافتی معیار کا

(۱) ۱۲ تا ۲۰ مئی ۱۳۹۷ھ (۳۱ مارچ تا ۸ اپریل ۱۹۷۷ء) کو مکہ مکرمہ میں اسلامی تعلیم پر ایک عالمی کانفرنس بلائی گئی تھی، جس کا اہتمام جدہ کی کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی نے کیا تھا، اور جس میں عالم اسلام اور مغرب کے کثیر التعداد ماہرین تعلیم اور دانشوروں نے شرکت کی تھی، حضرت مولانا کا موضوع ”سعودی عرب کا نظام تعلیم اور اس کا بہترین طریقہ اور اس کی مشکلات کا ازالہ“ تھا، حضرت مولانا نے یہ تقریر ۱۹ مئی ۱۳۹۷ھ (۱۷ اپریل ۱۹۷۷ء) کو اس جلسہ میں کی تھی جس کی صدارت امیر محمد ملک فیصل نے کی تھی۔

اندازہ اس ملک کی یونیورسٹیوں کی تعداد سے لگاتے ہیں، خواہ وہ ملکی زندگی میں کتنی غیر موثر کیوں نہ ہو، اور ان کی حیثیت اس ملک میں غیر ملکی سفارت خانوں کی ہو جس کا اس ملک کے معاشرہ اور اندرونی حالات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بیشتر حالات میں تو یہ یونیورسٹیاں ہی معاشرتی تباہی، اور ذہنی و اخلاقی انتشار، بے راہ روی، بددلی و اضطراب، بیکاری و مایوسی کا گھر ہوتی ہیں، اور وہاں کے طلبہ و فارغین بے راہ روی و بے چینی کے نقیب بن جاتے ہیں، جیسا کہ آج کل کے بہت سے مشرقی و ایشیائی ملکوں میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔

اسلامی مفکرین کی ذمہ داری

یہ تقلیدی اور غیر شعوری طرز فکر بدلنا چاہیے، اور ہم مسلمانوں کو (جن میں سرفہرست مفکرین و ماہرین ثقافت ہیں) دوسروں سے بڑھ کر حقیقت شناس، واقعیت پسند، انصاف پرور اور حق و صداقت کی گواہی دینے والا ہونا چاہیے، نہ یہ کہ ہم تخیلات و شاعری کے غلام اور لکیر کے فقیر ہو کر رہ جائیں، اور اس لیے ہمیں اپنا محاسبہ اور ایک سمجھدار و سنجیدہ تاجر کی طرح اپنے نفع نقصان کا موازنہ کرتے رہنا اور دیکھنا چاہیے کہ کتنی مسافت ہم نے طے کی اور کتنی باقی ہے، اور ہمارے فطری پروگراموں اور کاغذی منصوبوں اور عملی کامیابی اور حقیقی نتائج کا تناسب کیا ہے؟

دعوت و تعلیم اسلامی کی پہلی تجربہ گاہ

یہ ملک تعلیمات اسلام اور دعوت اسلام کی پہلی تجربہ گاہ ہے، اسی پاک سرزمین پر دنیا نے سب سے پہلے صدق و اخلاص، وفاداری و جاں نثاری، جوان مردی و بہادری کے بے مثال مناظر دیکھے تھے، یہ تاریخ کا وہ صفحہ زریں ہے جس کی ہر سطر نورانی ہے، اور جو یہاں کے رہنے والوں اور یہاں کے آنے والوں کو یکساں طور پر ایمان و عقیدہ اور سیرت و اخلاق کا درس دیتا ہے، یہاں تاریخ اسلام اس طرح مجسم ہو کر آ جاتی ہے جسے ہر انسان آسانی سے سمجھ سکتا اور آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، جبکہ مغرب کی مشہور یونیورسٹیاں اور ثقافتی

مرکز علمی تحقائق و مفاہیم کو ذہن نشین کرنے، تاریخی واقعات اور قدیم تہذیبوں سے لوگوں کو روشناس کرنے کے لیے اسٹیج اور ڈراموں کا سہارا لیتے ہیں، اور آثار قدیمہ اور پرانے شہروں کے لیے سفر کراتے اور نمائشوں اور کانفرنسوں کا اہتمام کرتے ہیں، جہاں طالب علم کچھ وقت ایک خاص تاریخی و تہذیبی فضا میں گزارتے ہیں، جو گرد و پیش کی فضا سے مختلف ہوتی ہے، اس طرح وہ عہد ماضی کی یادیں تازہ کرتے ہیں، مگر یہ سب مصنوعی کاوشیں ہیں جو حقیقت سے دور ہوتی ہیں۔

لیکن یہاں رہنے والے طالب علم کے ذہن میں اسلام کے معانی و مفاہیم موجود ہی نہیں ہوتے، بلکہ وہ انھیں میں زندگی گزارتا ہے، اس صحرا کا ہر ذرہ اور اس جزیرہ کا ہر پہاڑ اسلام کی گذشتہ تاریخ کے کسی نہ کسی واقعہ کی خبر دیتا ہے، اور اس جزیرہ کی دعوت و پیام اور اس کی راہ میں بننے والے پاک خون کا پتہ دیتا ہے، اور زمانہ جاہلیت کے دور فقر و جہالت، اور گمنامی کے بعد پھر اسلام کے عطا کیے ہوئے علم اور اس کے لائے ہوئے دور خوش حالی و اقبال مندی کی تصویر کھینچتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ اس کا فخر کس کو حاصل ہے، اس حیرت انگیز انقلاب و تغیر کا سرچشمہ کیا ہے، جس کی تاریخ انسانی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

مرکز حج و عبادت

پھر ان شہروں کو اللہ تعالیٰ نے حج کا مرکز بنایا ہے، اس لیے ان میں ایک غیر معمولی روحانی کشش ہے، وہ نفوس و قلوب پر ایسا اثر ڈالتے ہیں جو دنیا کا کوئی شہر نہیں ڈال سکتا، دنیا میں کہیں اتنے مؤمن دل، پاک و سعید اور گرم جوش روحمیں رکھنے والے ایک جگہ جمع نہیں ہوتے، جنہیں ایمان و ذوق و شوق، مرکز اسلام اور گوارہ وحی کی محبت کشاں کشاں لاتی ہے، اور جو اس جذبہ کے ساتھ یہاں آتے ہیں، جیسے پروانہ روشنی پر اور پیاسا پانی پر گرتا ہے، ان کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ پلکوں کے بل چل کر یہاں آئیں، چنانچہ اس راہ میں وہ قیمتی سے قیمتی چیز کو بھی بیچ سمجھتے ہیں، اور بڑی سے بڑی تکلیف اٹھا لیتے ہیں، اس طرح یہ فضا ذوق و ایمان

کی برقی لہروں سے بھر جاتی ہے، اور نکھی ہوئی طبیعتوں اور بے جان دیواروں اور خشک لکڑیوں کو بھی اس کا جھٹکا لگتا ہے، کوئی اس ایمانی مدرسہ سے بھی زیادہ سرگرم مدرسہ بتا سکتا ہے جو علم و اخلاق کے پیغام کو اس خوبی سے دلوں میں اتار سکتا اور طبیعتوں میں وہ قوت پیدا کر سکتا ہو جو مادی دھاروں اور عصری رجحانات پر قابو پالے؟

ان شہروں کی زبان عربی ہے، جس میں قرآن مجید نازل ہوا، جو رسول اللہ ﷺ کی مادری زبان ہے، اور جس میں قرآن دنیا کے ہر ملک میں پڑھا جاتا ہے، اور جس میں اذانیں ہر خطہٴ ارض سے بلند ہوتی ہیں۔

بجز اللہ اس جزیرہ میں دو دین نہیں، یہاں ایک ہی دین ہے، اور وہی حکمراں ہے، پھر اخیر میں اللہ تعالیٰ نے سعودی حکومت کو شعاع اسلام کو سر بلند کرنے اور شرعی حدود و قوانین کے اجراء و نفاذ کا شرف عطا کیا، اور یہ حکومت دعوت اسلامی، توحید و سنت، اور اتباع سلف صالح کی بنیادوں پر قائم ہوئی، اس سے صالح و باشعور مسلمان کے نشوونما کے لیے ایک سازگار فضا پیدا ہوئی، تعلیم و تربیت کی سہولت حاصل ہوئی، اور وہ تمام رکاوٹیں دور ہوئیں جن سے وہ مسلمان ملک دوچار ہیں جن کو صحیح اسلامی قیادت اور اقتدار نصیب نہیں۔

تعلیمی کوششوں کا نتیجہ

حضرات! ہم یہاں ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس سب کے بعد کیا یہ بات سو فی صدی یقینی اور متوقع نہ تھی کہ یہاں کا تعلیم یافتہ نوجوان بلند اخلاق، حسن سلوک، ضبط نفس، صبر و تحمل، سرگرمی، عالی ہمتی، اور اللہ کے مہمانوں کے لیے ایثار میں، دور جاہلیت کے قبیلہٴ قریش کی مہمان نوازی سے آگے ہونے میں ایک مثالی نوجوان ہوگا، اور یہاں کا تعلیم یافتہ فرد دوسرے ملکوں کے تعلیم یافتہ افراد سے زیادہ اخلاق عالیہ سے آراستہ ہوگا، اور جو علم و ثقافت میں جتنا ہی آگے ہوگا، تہذیب و اخلاق میں بھی اتنا ہی بلند ہوگا، کیونکہ اس کی تربیت بامقصد و منصوبہ بند اسلامی ثقافت کی گود میں ہوئی ہے، جس پر اگر انقدر رقوم صرف

ہوئی ہیں، اور جس کے لیے اساتذہ و معلمین کی ایک فوج سرگرم کار رہی ہے، اور یہ مدارس کعبہ کے سایہ اور مسجد نبوی کے صحن اور اسلام کے گہوارہ میں قائم ہوئے ہیں۔

ملک کی وزارت تعلیم کی تعلیمی کوششوں کا نتیجہ بہت قیمتی ہے، جس سے کوئی عاقل اور انصاف پسند انکار نہیں کر سکتا جو اس ملک کے ماضی و حال سے آگاہ اور اس سے باخبر ہو کہ پہلے یہاں جہالت کس قدر تھی، اور مدارس و تعلیمی مراکز حتیٰ کہ ابتدائی مکاتیب کی بھی کتنی کمی تھی، اور عرب کے بدو اور دیہاتی علم، اسلام اور انسانیت سے کس قدر دور تھے، جہالت اور عزت گزینی نے ان میں کیسے وحشیانہ اخلاق، انسانی جان بلکہ مسلمان کی جان کی بے قدری، قتل و غارت گری کے عیوب پیدا کر دیے تھے، اور خارجی دنیا سے تعلق کے ذرائع اور ابتدائی تہذیب کے وسائل بھی کتنے محدود تھے، اس لیے جب ہم ماضی قریب کا حال سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک حیرت انگیز انقلاب، ایک لمبی چھلانگ نظر آتی ہے، جو ناقابل یقین ہونے کے لحاظ سے افسانوی معلوم ہوتی ہے، اس موقع پر ہم سعودی حکومت کی کوششوں اور ملک کو علمی و تہذیبی ترقی کی راہ پر لانے کی کوششوں کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مگر نتیجہ اس وقت کہیں زیادہ کمیت و کیفیت کا حامل اور مزید حیرت و استعجاب کا سبب بنتا جب ذہنی تعمیر، سیرت سازی اور اخلاقی تربیت کے عوامل پورے طور پر کارفرما ہوتے، اور وہ تضاد ختم کر دیا گیا ہوتا جس کے اکثر مسلم ممالک شکار ہیں، تعلیمی مراکز (جن کا اثر ان کی دیواروں ہی تک محدود رہتا ہے) اور زندگی کے مواج سمندر کے درمیان یہ خلیج حائل نہ ہوتی، تعلیم اور ذرائع ابلاغ میں کامل ہم آہنگی اور ان داخلی و خارجی عوامل میں گہرا رابطہ ہوتا، وہ ایک لائن پر اور ایک مقصد کی طرف بڑھ رہے ہوتے۔

مادیت کا ہسٹیریا

یہاں میں اشارتاً راستہ کی بعض بڑی دشواریوں کا ذکر کروں گا جو ملک و قوم اور تعلیمی و تربیتی اداروں کے درمیان حائل ہیں، اور جو اگر ماہرین تعلیم اور اساتذہ و معلمین کی کوششوں کو یکسر ناکام نہیں بناتیں تو ان کے اثر کو محدود و ضرور کر دیتی ہیں، جیسا کہ مندرجہ نکات سے ظاہر ہوگا:

۱- تعلیم جتنی بھی ترقی کر جائے اور دانش گاہوں اور جامعات کا جال کتنا ہی پھیلا دیا جائے، وہ اس وقت تک اپنے میٹھے پھل اور مطلوب نتیجہ نہیں دے سکتیں جب معاشرہ غیر معمولی اور تیز رونفسیاتی یا اخلاقی کیفیت سے دوچار ہو، اور جس کو مادیت کا "ہسٹیریا" لاحق ہو، جس کے سبب اس پر کھوکھلے نمونوں، مادیت کی تقدیس اور اہل دُول کے احترام بچا کی حکمرانی ہو، تو ایسی صورت میں یونیورسٹیوں اور دوسری درس گاہوں کے فرزند حتیٰ کہ مفکرین و محققین بھی اس سیلاب کے آگے نہیں ٹھہر پاتے، وہ اس تیزاب میں اس طرح تحلیل ہو جاتے ہیں جیسے گوشت کا ایک ٹکڑا کان نمک میں پڑ کر نمک بن جاتا ہے۔

اس لیے ملک کی معاشرتی حالت اور اس کے رجحانات و میلانات سے چشم پوشی جائز نہیں، بلکہ معاشرہ کو راہ راست پر رکھنے اور اس کو ان بیماریوں اور وباؤں سے بچانے کی ضرورت ہے جو اسے چوس رہی ہیں، یہ کام دینی و اخلاقی طریقوں، صالح ادب اور با مقصد صحافت کے ذریعہ ہو سکتا ہے، جس کو انسانیت کا پاس، خدا کی شرم اور لوگوں کی عزت و ناموس کا احترام ہو۔

رضا کارانہ خدمت کی ضرورت

۲- عملی نمونوں، اونچے طبقہ میں کفایت شعاری، سادگی و ایثار کی نظیروں، اہل علم میں رضا کارانہ اور لوجہ اللہ خدمت اور قربانی کی عملی مثالوں کی ضرورت ہے، اسوہ حسنہ کے ایسے نمونے (جیسا کہ سب کو معلوم ہے) ہر قوم اور ہر زمانہ میں اپنا نفسیاتی اثر رکھتے ہیں، گذشتہ نسلوں میں انھیں نے زندگی اور جواں مردی کی روح پھونکی تھی، اور جس کے سبب صف اول کے علماء و اہل قلم، مفکرین و محققین، مصلحین و مجددین دیکھنے میں آئے، جنھوں نے اللہ کے لیے تعلیم و تدریس اور اصلاح و تجدید کا کام کیا، اور دنیا سے کسی صلہ و انعام کے طالب نہیں ہوئے، ان میں ایسے بلند قامت مفکر اور عبقری بھی ہوئے جنھوں نے بہت سے مواقع پر تاریخ کا رخ پھیر دیا،^(۱) لیکن ہمارے موجودہ مدرسوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ افراد تو بہتے دھارے کے ساتھ ہو گئے، اور زمانہ کی ہوا اور معاشرہ کے اس رجحان کا ساتھ دینے لگے کہ اپنے لیے بہتر مستقبل اور

(۱) تفصیل کے لیے ہماری کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" ملاحظہ ہو۔ (ح)

خوشگوار زندگی کے راستے کیسے ہموار کیے جائیں، اور اس مرض کا شکار ہو گئے اور ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جس کے لیے (Careerist) کا خطاب ہی زیادہ مناسب و حسب حال ہے۔

نشر و اطلاع

۳- ہر ملک میں نشر و اطلاع (Radio & Television) کا شعبہ تمام شعبوں سے زیادہ وسیع و موثر ہو گیا ہے، اور جو ’ترقی یافتہ مہذب‘ ملکوں میں ہو اور پانی کی طرح ضروری سمجھا جانے لگا ہے، جس کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اقدار کے تعین، اشیاء کے پیانوں، اور میلانات و مرغوبات میں تبدیلی پیدا کرنے کا موقع صرف اسی کو حاصل ہے، اس کی حیثیت اس وقت قلب انسانی کی ہو گئی ہے، جو اگر ٹھیک رہتا ہے تو سارا معاشرہ ٹھیک رہتا ہے، اور اس کی خرابی سے سارا معاشرہ خراب ہو جاتا ہے، اس کے بعد صحافت کا نمبر آتا ہے، جو پڑھے لکھے لوگوں کے لیے جاو کا اثر رکھتی ہے، ذہن بناتی ہے، ذوق ڈھالتی ہے، اور جس کے اثر سے بقول اقبال ع

جو تھانا خوب بتدرج وہی خوب ہوا

کا ظہور ہوتا ہے۔

تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ کے درمیان ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب ہمارے اسلامی معاشرے میں مسلم نوجوان فکری انتشار اور تباہ کن تعطل کے دور سے گزر رہے ہیں، اور اس نے مصلحین، معلمین اخلاق کی مہم کو مشکل سے مشکل تر بنا دیا ہے، اور تعلیم و تربیت سے وابستہ لوگوں کو بعض اوقات یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کہیں یہ ساری سعی و جانفشانی ”کوہ کندن و کاہ بر آوردن“ کے مرادف تو نہیں ہے؟

آج کا مسلمان نوجوان

آج کا مسلمان نوجوان ایک تلخ تجربہ اور خطرناک کشمکش سے گزر رہا ہے، وہ وزارت نشریات، صحافت اور ٹیلی ویژن سے انتشار انگیز ترغیبات و رہنمائی سے دوچار ہوتا ہے، اور ایسے نشریاتی پروگرام سنتا ہے جو اسلامی تربیت کے بچے کھچے اثرات کو بھی مٹا دینے پر تلے

ہوتے ہیں، اس طرح وہ اس میں فکری بغاوت اور نفسیاتی اضطراب پیدا کر دیتے ہیں، اخبارات و رسائل صبح صبح سے متعفن و مسموم غذا فراہم کرتے اور کچھ اور پڑھنے سے پہلے جذبات کو برا بھانتہ کرنے والا سامان مہیا کر دیتے ہیں، چنانچہ سب سے پہلے جن چیزوں پر اس کی نگاہ پڑتی ہے وہ شہوانی تصویریں، ہيجان پرور عنوانات، شک و شبہ پیدا کرنے اور ایمان و یقین کو کمزور کرنے والے مقالات ہوتے ہیں جنہیں وہ شوق و رغبت کے ہاتھوں سے لیتا ہے، پھر اس کے ہاتھوں میں ایسی علمی کتابیں آ جاتی ہیں جن کے نام اور عنوانات بھاری بھر کم اور مرعوب کن ہوتے ہیں اور جوان لوگوں کے قلم سے نکلی ہوتی ہیں جن کے فضل و کمال پر اس نوجوان کا ایمان ہوتا ہے، اس طرح وہ ایسا مواد پڑھتا ہے جو اس کے لیے دین، تاریخ اسلام، شریعت اسلامی کے، بلکہ زبان و ادب کے بھی اولیں سرچشموں و ماخذوں کو بھی مشکوک و مشتبہ قرار دیتا ہے، اور اسے اس امت کی صلاحیت، اس کے پیغام کی ابدیت، اور عربی زبان کی اہلیت و صلاحیت کی طرف سے شک میں مبتلا کر دیتا ہے، وہ افکار و خیالات اور علمی نظریات کے اس عجیب و غریب ”آ میزہ“ کو پانے کے بعد ایسی حیرانی میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کے مقابل کوئی حیرانی نہیں ہوتی، اور کوئی تعجب نہیں اگر پختہ فکر اور صاحب عقل و رائے انسان بھی حیرت میں پڑ جائے، چہ جائیکہ ایک خام فکر اور نوجوان جس کے شعور کی آنکھیں بھی نہیں کھلیں، اس سے یہ امید کیے کی جاسکتی ہے کہ وہ متصادم دھاروں کے آگے ٹھہر سکے گا؟ یہ اس گاڑی کی طرح ہے جس کے دونوں طرف طاقتور گھوڑے جتے ہوں اور دونوں مختلف سمتوں میں اسے کھینچنے کی کوشش کر رہے ہوں، تو اس طرح اس کے سواروں کا حیرت میں پڑ جانا قابل حیرت نہیں، اسی طرح ہمارے نوجوانوں کو کسی کر دہ قرار نہیں۔

ادبی ارتداد

وہ ادب جو کم از کم نصف صدی سے ہمارے پاس آ رہا ہے، جس کے ہاتھ میں دینی و ذہنی رہنمائی کی زمام ہے، اس نے نئی نسلوں اور نوجوانوں بلکہ بہت سے بڑے بوڑھوں کے دلوں میں شک و بے چینی پیدا کر رکھی ہے، ان کو اپنے وجود کے ساتھ تمام بدیہیات و مسلمات

میں بھی شک لاحق ہو گیا ہے، ان کتابوں نے جن کی تصنیف میں محض سستی دولت و شہرت حاصل کرنے اور نوجوانوں سے داد و تحسین پانے کا جذبہ کارفرما تھا، ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں شک و حیرت اور تضاد و کشمکش پیدا کر دی ہے۔

تفریحی سامان کی کثرت: ایک لمحہ برفکر یہ

اس کے ساتھ تفریحی سامان کی کثرت اور بے مقصد اور ہیجان خیز ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام بھی مشرق و مغرب کے ماہرین تربیت اور نوجوانوں کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے فکر و تردد کا باعث بن گئے ہیں، اس زیادتی نے نوجوانوں کو صبر و سنجیدگی، مطالعہ کی یکسوئی اور طالب علمانہ تیاریوں کے بجائے تفریح و آرام طلبی اور ہر اس چیز سے فرار سکھا دیا ہے جو محنت و مشقت اور دیدہ ریزی کی طالب ہو، اس صورت نے بہت سے ماہرین تربیت و نفسیات کو اس اعتراف پر مجبور کر دیا ہے کہ اس رجحان نے بہت سے نوجوانوں کو مہم جوئی کے طور پر لوگوں کی جان و مال سے کھیلنے پر آمادہ کر دیا ہے، اور زمام کار ماہرین تربیت اور خاندان کے سرپرستوں کے ہاتھ سے نکل گئی ہے، تعلیمی معیار حد درجہ پست ہو گیا ہے، کیونکہ ان پروگراموں نے اس کے وقت و محنت کا بڑا حصہ گھیر لیا ہے، یہ ایک ایسا مسئلہ بن گیا ہے جو ماہرین تعلیم و تربیت کی پوری توجہ، فوری حل اور کامیاب علاج کا طالب ہے۔

مغرب میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان - سنگین خطرہ

۴- اس سے بڑھ کر اہمیت رکھنے والی وہ وجہ ہے جو تمام مسلم و عرب ممالک میں پھیل گئی ہے، وہ بڑی تعداد میں نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ و امریکہ بھیجنے کا رواج ہے، حالانکہ نہ ان کو ذہنی پختگی حاصل ہوتی ہے نہ اخلاقی تربیت، یہ خطرہ اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب وہ عنفوان شباب کی منزل میں ہوں، جو طالب علم کی زندگی کا سب سے نازک و حساس (Sensitive) دور ہوتا ہے، اس وقت اگر یہ نوجوان ان و بازوہ ملکوں کو بھیجے جائیں جہاں اخلاقی جذام پھیلا ہوا ہے، جہاں پاکیزہ زندگی اور اقدار کی بنیادیں متزلزل ہیں، اور ماہرین

تربیت کے ہاتھوں کے طوطے اڑ رہے ہیں، تو یہ اس ابھرتی نسل کو داؤں پر لگانا ہے جس کے ہاتھوں میں کل زمام اقتدار آنے والی ہے، اس کے بعد بھی یہ امید رکھنا کہ وہ مغربی ثقافت اور مفید مغربی علوم کے خوشگوار پھل پائیں گے اور اس کی برائیوں اور کڑوے پھلوں سے بچے رہیں گے، خوش گمانی کی انتہا اور فطرت اور آئین قدرت سے چشم پوشی کے مرادف ہے، خصوصاً جبکہ ان نوجوانوں کا قیام یورپی اور امریکی گھرانوں میں ہو، اور مخصوص بورڈنگ ہاؤس کا انتظام نہ ہو جس کا ماحول اسلامی ہو اور جہاں صالح علمی و فکری غذا بھی فراہم ہوتی ہو، تو مغربی تہذیب کے اس منجدرہ میں ان غریب نوجوانوں کی زبان حال پر یہی ہوگا کہ۔

درمیان قعر دریا تختہ بدم کردہ

بازمی گوئی کہ دامن ترکمن ہشیار باش!

تعلیم نسواں

۵- اہمیت و نزاکت میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی کچھ کم نہیں، یہ قضیہ بھی بڑی دانش مندی، چینی و فکری جرأت اور ”تعلیم نسواں“ کے چلے ہوئے مفہوم کی تقلید سے آزادی کا طالب ہے، تعلیم نسواں کے موجودہ نظام کو مغربی اور مشرقی ملکوں نے ان حالات میں اپنایا ہے جو ہمارے حالات سے قطعاً مختلف ہیں، ہمارے ملکوں میں اس سلسلہ میں ایسی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جو ایجاد و اختراع، جرأت و ذہانت پر مبنی ہو۔

اقوام ملل کی تاریخ شاہد ہے کہ ان کے زوال و انحطاط کا سب سے بڑا سبب جس نے ان قوموں کو نیست و نابود کر دیا ہے اور بڑی عظیم تہذیبیں فنا کے گھاٹ اتر گئی ہیں، خاندانی نظام کی انتری، گھریلو زندگی کا عدم توازن اور عورتوں کی اس سے عدم دلچسپی، اس کی ذمہ داریوں سے فرار، بے حیائی کی حد تک بے پردگی، اور جاہلی زینت و آرائش ہے، ہم نے زوال آمادہ اور انحطاط پذیر معاشرہ اور تباہی کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی قوموں میں ہمیشہ یہ مرض پھیلنے دیکھا ہے، جہاں عورتیں گھریلو زندگی اور اس کی ذمہ داریوں سے کترانے لگتی ہیں، فرائض مادری سے پہلو تہی کرنے لگتی ہیں، ان معاشرہ میں

عورتیں ان تمام ذمہ داریوں سے الگ رہ کر مردوں کے کام اور ان کی سرگرمیوں میں شریک ہونے لگتی اور ان کے دوش بدوش چلتے ہوئے زندگی کے تمام میدانوں میں ان سے آگے بھی نکل جانا چاہتی ہیں، مغربی معاشرہ نے بھی یہی روش اپنائی جس کے نتیجہ میں خاندانی نظام اور معاشرتی توازن درہم برہم ہو گیا، اب مغرب کے ماہرین عمرانیات جرأت و صفائی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر رہے ہیں، لیکن اب معاملہ ان کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے، پانی سر سے اونچا ہو گیا اور پینا نہ حیات پھلک پڑا ہے، اور وہ اس تہذیب کے قمر ہی خاتمہ پر پریشان و ہراساں ہیں۔

مقامِ عبرت و نصیحت

اب کسی بھی مشرقی اسلامی ملک میں اس نظام کی نقل اور اس ناکام تجربہ کا دہرا نالک کی سالمیت اور شخصیت و دعوت کو خطرہ میں ڈالنا ہے، اس لیے ہمیں ان تجربوں سے عبرت حاصل کرنا اور خاص طور پر ان ملکوں میں اس کے اعادہ کی کوشش سے بچنا چاہیے، جن پر اسلام کے مستقبل کا انحصار ہے، ”السَّعِيدُ مَنْ وُعِظَ بِغَيْرِهِ“ (خوش بخت وہ ہے جو دوسروں کے حال سے عبرت و نصیحت اختیار کرتا ہے)۔

میں اپنی بات کو (جو کچھ طویل ہو گئی ہے اور بات بھی کچھ ایسی ہی تھی) اپنے ان آخری الفاظ پر ختم کرتا ہوں کہ اس ملک کی تعلیمی پالیسی، اصولی طور پر اسلامی حکمت عملی ہی پڑنی اور عام طور پر تعلیمی نظام اسی پالیسی پر کار بند بھی ہے، حکومت سعودیہ تعلیم کے لیے اپنے وسائل سے بڑی عالی ہمتی اور فیاضی سے کام لے رہی ہے، اور قوم بھی نمایاں طور سے اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے، اور وہ فضا و ماحول بھی موجود ہے جو اسلامی جذبات کو تازہ کرتا اور اسلامی دعوت کی یاد دلاتا رہتا ہے، یہ بات بڑی امید افزا اور روح پرور ہے۔

لیکن مقاصد اسی وقت بروئے کار آسکتے ہیں جب رکاوٹیں اور متضاد چیزیں ہٹا دی جائیں، اور عوامل و مؤثرات اور تعلیم و تربیت کے درمیان کامل ہم آہنگی ہو جائے، اور وہ چور دروازے بند کر دیے جائیں جن سے فساد، کمزوری، اور تضاد کو راہ ملتی ہے، خواہ وہ داخلی ہوں یا

خارجی، اور یہ ایسی مملکت کے لیے ناممکن بات نہیں جو دعوت و عقیدہ کی اساس پر قائم ہوئی ہے، جس نے ہر ملک کے اسلامی معاملات پر توجہ کی ہے، دوردراز علاقوں میں اسلامی دعوت و تعلیم کا بندوبست اور دنیا میں اسلامی اتحاد کا علم بلند کیا ہے، اور نہ یہ اس وزارت تعلیم کے لیے کچھ مشکل کام ہے جس کی سربراہی اصحاب دعوت و عقیدہ، صاحب غیرت، دینی فہم رکھنے والے حضرات کر رہے ہیں، اور اگر ایسا ہو گیا تو یہ معاصر اسلامی تاریخ کا ایک بڑا کارنامہ ہوگا اور ہر اسلامی ملک کے لیے مثال بن جائے گا:

﴿وَيَوْمَئِذٍ يُفْرِحُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللَّهِ﴾ [سورة الروم: ۴-۵] ”اور اس دن اہل ایمان اللہ کی نصرت کے ظہور سے فرحان و شاداں نظر آئیں گے۔“ (۱)

(۱) ”حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب: امیدوں اور اندیشوں کے درمیان“ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی؛ شائع کردہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، طبع اول ۱۹۷۹ء، (صفحہ ۷ تا ۹۰)۔

نظام تعلیم و تربیت کی بنیادیں^(۱)

حکمت مومن کی گم گشتہ دولت ہے

حضرات! میں اپنے دل کی گہرائیوں سے آپ حضرات کا شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ اس مقدس ملک میں تعلیم و تربیت جیسے اہم موضوع پر گفتگو کرنے کا مبارک موقع عطا فرمایا، اور مجھ جیسے فقیر بے نوا کے ساتھ اس قدر حسن ظن اور اعتماد کا مظاہرہ کیا، یہ جہاں آپ حضرات کی عالی ظرفی، وسعت قلبی، اس موضوع سے آپ حضرات کی دلچسپی اور نبی ﷺ کے اس فرمان پر کامل ایمان کی دلیل ہے کہ ”حکمت مومن کی گم گشتہ دولت ہے، یہ جہاں بھی ملے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے“،^(۲) ساتھ ہی ساتھ اس ملک کے متعلق آپ حضرات کے نقطہ نظر کا بھی اس سے اظہار ہوتا ہے کہ آپ اسے مسلمانوں کا اولین اسلامی وطن قرار دیتے ہیں، جس کی وجہ سے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے حالات و مسائل سے دلچسپی لے، اپنے اعلیٰ ترین جذبات اس پر قربان کر دے، اپنے تجربات کا قیمتی اثاثہ اس کی نذر کر دے، اور اپنے علم و عقل اور قلب و ضمیر کے شعور و احساسات کا خلاصہ اور ان کا عطر نکال کر اس کے حضور پیش کر دے۔

جہالت کے خلاف جنگ

اس قابل رشک مقام پر کھڑا ہوا میں ایک ذہنی کشمکش سے دوچار ہوں، دو شدید اور باہم

(۱) ریاض یونیورسٹی (سعودی عرب) میں ۱۳ نومبر ۱۹۶۸ء کو کی گئی تقریر کا ترجمہ بقلم: مولانا نور عظیم ندوی۔

(۲) رواہ الترمذی فی جامعہ، أبواب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادۃ، حدیث رقم ۲۶۸۷

متضاد احساسات میرے دل و دماغ کو متاثر کرنا چاہتے ہیں، پہلا احساس مسرت و شادمانی، حقائق کے اعتراف اور قدر شناسی کا احساس ہے، کیونکہ جب میں اس وسیع و عریض ملک میں کالجوں، اسکولوں اور ابتدائی مدارس کا جال پھیلا ہوا دیکھتا ہوں جس سے نہ کوئی بڑا شہر چھوٹا ہے، نہ چھوٹے سے چھوٹا دیہات باقی بچا ہے، اور اس ملک میں علم و فن کی اشاعت کے لیے مخصوص کی ہوئی بڑی بڑی رقموں کو دیکھتا ہوں جس پر اس زمانہ کی کوئی بھی انتہائی ترقی یافتہ حکومت فخر کر سکتی ہے، اور ان اساتذہ اور معلمین کی تعداد پر نظر ڈالتا ہوں جو باہر سے بلائے گئے ہیں، اور برابر بلائے جا رہے ہیں، جن کی پذیرائی اور اعزاز و اکرام میں وزارت تعلیم کی جانب سے کوئی کسر نہیں چھوڑی جا رہی ہے، اور سعودی طلبہ تعلیم کی ہر منزل میں جن رعایتوں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور ہر طرح سے ان کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے، جس کو باپ کی شفقت اور ماں کی محبت سے موسوم کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، اور مغرب و مشرق کے متعدد ممالک میں جس کی مثال نہیں ملتی، اسی طرح جہالت کے خلاف جنگ میں وزارت تعلیم کے ذریعہ حکومت کی جدوجہد پر نظر ڈالتا ہوں، پھر تعلیم کی طرف ترکوں اور شرفائے مکہ کی حکومتوں کی توجہ اور اس حکومت کی توجہ و انہماک کا موازنہ کرتا ہوں، اور سابق حکومتوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد، اور اس حکومت میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد کا مقابلہ کرتا ہوں، تو میرے دل و دماغ میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے، اور مملکت سعودیہ عربیہ کے مرتب کیے ہوئے حالیہ محیر العقول تعلیمی پروگرام کی عظمت کے اعتراف پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں، تعلیمی ترقی کا یہ بلند معیار مجھے حیران و بے خود کر دیتا ہے، اور حقیقت حال کے اعتراف اور ان ذمہ داروں کی مدح و ستائش کے علاوہ کسی بات کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی جن کے سر یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دینے کا سہرا بندھتا ہے۔

تعلیم و تربیت کے میدان میں مملکت سعودیہ عربیہ نے مختصر سی مدت میں طویل ترین مسافت طے کر لی ہے، اور چند ہی سالوں میں جاہل اور ان پڑھ گنواروں میں لکھنے پڑھنے کا عام رواج ہو گیا ہے، جن سے دیہات کے علاوہ شہر بھی بھرے پڑے تھے، اور مدارس میں

اپنی تعلیم مکمل کرنے والوں، مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں اور اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کرنے والوں، مختلف تحقیقی موضوعات میں خصوصی استعداد پیدا کرنے والوں اور متعدد غیر ملکی زبانوں کے ماہرین کی ایک فوج تیار ہو گئی ہے، یہ سارے حقائق وزارت تعلیم کی کامیاب جدوجہد اور موجودہ حکومت کے کارناموں پر حیرت آمیز مسرت کا احساس پیدا کرتے ہیں، اور مسرت کا یہ قوی احساس دل و دماغ پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ کسی دوسرے پہلو پر غور و فکر کا موقع ہی نہیں دیتا، اور پر جوش مبارکباد پر مجبور کر دیتا ہے۔

مسرت و شادمانی کا احساس

میں اس وقت اگر کسی ایسے ملک میں ہوتا جو پلک جھلکتے ہی وجود میں آیا ہو، اور بس صبح و شام ہی میں دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں آ گیا، جنگلی اور وحشیانہ طرز زندگی کو چھوڑ کر متمدن زندگی اختیار کر لی، اس کی کوئی ایسی خصوصیت و امتیاز نہیں جس پر وہ فخر کرتا ہو، نہ وہ کسی پیغام کا حامل ہے، نہ اس کے سامنے کچھ مخصوص و متعین عقائد و اصول ہیں، جن پر وہ ایمان رکھتا ہے اور جن کے ساتھ جسم و جان اور لفظ و معنی کا سارنباط و تعلق رکھتا ہے، نہ اس کے پاس انسانیت کے لیے کوئی مخصوص و معروف دعوت ہے، نہ اس کے ماضی کی شاندار تاریخ ہے جس سے وہ بہتر اور بلند افکار و اقدار اخذ کر سکے، اور اس سے اپنے اندر قوت و اعتماد پیدا کر سکے، اگر میں اس وقت کسی ایسے ہی نومولود ملک میں ہوتا جو انسانی زندگی اور انسانی مسائل اور معاصر قوموں سے اگر کوئی تعلق رکھتا ہے تو صرف پیٹ اور معدہ یا صنعت و حرفت یا لہجہ اور زبان یا مصوری و خطاطی کا یا صرف سیاسی اور سفارتی تعلقات رکھتا ہے، تو صرف یہی احساس مسرت و شادمانی اور اعتراف و قدر شناسی کا احساس۔ میرے افکار و اقوال پر چھایا رہتا۔

خوف و اندیشہ

دوسرا احساس یا دوسرا جذبہ خوف و اندیشہ کا جذبہ ہے، اور سچی اور پر خلوص محبت ہمیشہ خوف و اندیشہ کا باعث بنتی رہی ہے، اور محبت کے ساتھ جذبہ غیرت و حمیت کا وجود بھی ہمیشہ

لازمی رہا ہے۔

خوف و اندیشہ کی وجہ یہ ہے کہ اس جزیرہ نما کو حکمت الہی نے صدیوں پہلے سے ایک امتیازی حیثیت کا حامل بنایا ہے، جو اس کی طبیعت اور فطرت میں رچ بس گیا ہے، اور طویل اور سخت تاریخی سفر میں ہر منزل پر اس کی یہ امتیازی حیثیت برقرار رہی ہے، خواہ وہ سفر سیدھا اور آسان رہا ہو، یا پیچدار اور دشوار گزار، کسی حالت میں معمولی وقت کے لیے بھی اس کا یہ طبعی اور فطری وصف زائل نہیں ہوا، اور طبعی، تاریخی، اخلاقی اور اجتماعی سارے عوامل اس معاملہ میں اس کے مددگار ہی ثابت ہوئے ہیں، بلکہ ان عوامل کا تقاضا تھا کہ یہ جزیرہ نما اپنے اس امتیاز کو باقی رکھے، اور اس کی حفاظت کرتا رہے، نیز یہ جزیرہ نما انسانیت کی فلاح و کامرانی کے لیے ایک پیغام کا حامل رہا ہے، اللہ نے اس کو اس پیغام کے لیے اور اس پیغام کو اس علاقہ کے لیے منتخب فرمایا ہے، اور دونوں کے مصالح ایک دوسرے سے متعلق ہیں، ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوئی بھی کوشش شرمناک اور محرمانہ کوشش قرار دی جائے گی، مزید برآں یہ ایک غیر فطری کوشش ہوگی جو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

احتساب و جہاں بانی

انہی دونوں تاریخی اور طبعی حقیقتوں نے جزیرۃ العرب کو تاریخ کے ہر دور میں مرکزی مقام عطا کیا ہے، اور قیادت و رہنمائی اور احتساب و جہاں بانی کے بلند منصب پر فائز کیا ہے، اور دوسروں کی نقالی، تقلید، اتباع اور غیروں کی شاگردی اور طفیلی پن کے مقام سے بہت بلند کر دیا ہے، دوسروں کے بنائے ہوئے پروگرام کو نافذ کرنا، ان کے نقشوں میں رنگ بھرنا، یا اوروں کے علوم و تجربات کو من و عن قبول کر لینا، اس کی شان کے منافی ہے، تہذیب و تمدن کا مسئلہ ہو یا طریق تعلیم و نظام تربیت، ہر معاملہ میں خود شناسی و خود اعتمادی اس کا فطری تقاضا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس ملک کا تعلیمی مسئلہ اتنا سادہ اور آسان نہیں جتنا بہت سے ماہرین تعلیم و تربیت سمجھتے ہیں، اس مسئلہ میں کامیابی اور مشکلات پر قابو پالینے کا اندازہ صرف اس سے نہیں کیا جاسکتا کہ عوام میں پڑھنے لکھنے کا رواج بہت ہو گیا ہے، بڑوں اور لڑکیوں کے بے شمار

مدر سے قائم ہو گئے، کالجوں اور اسکولوں کی بڑی تعداد وجود میں آ گئی، بعض یونیورسٹیاں بھی قائم ہو گئیں، اور ان میں تعلیم مکمل کرنے والوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے، بڑی تعداد میں طلبہ دنیا کے مختلف تعلیمی مراکز میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جا رہے ہیں، اور امتیازی کامیابیوں کے ساتھ واپس ہو رہے ہیں، اور مختلف تعلیمی اور انتظامی ذمہ داریاں سنبھال رہے ہیں۔ ہاں، ممکن ہے اسے افریقہ کے کسی گننام ملک کے لیے کامیابی کا اعلیٰ معیار قرار دیا جائے جو جدید تہذیب و تمدن کے زمرہ میں نیا نیا داخل ہوا ہو۔ یہاں تک کہ بدھ ازم کے پرستار جاپان اور برہمنیت کے پیروکار ہندوستان نے بھی ناخواندگی اور جہالت کے خلاف جدوجہد اور محض علم و فن کی اشاعت کو اپنی منزل مقصود اور معیار کمال بنانا پسند نہیں کیا، بلکہ انھوں نے ضروری قرار دیا کہ یہ علوم و فنون ان کے قدیم فلسفہ اور ان کی تہذیب و تمدن کے رنگ میں رنگے ہونے ہوں، اور ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں تک اترے ہوئے نظریات و افکار، اور ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے عقائد سے ہم آہنگ ہوں، جن پر وہ قوی ایمان رکھتے ہیں اور ان پر مضبوطی سے قائم ہیں۔

آزادی فکر اور روسی نظریات

اسی طرح سوویت روس جس نے تمام ادیان و مذاہب کو کلی طور پر رد کر دیا ہے، اور آزادی فکر و رائے میں کافی آگے بڑھا ہوا ہے، جس کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ ہر انسان کو اپنی پسند اور انتخاب کی آزادی دیتا ہے، وہ ہر قسم کے حدود اور پابندیوں سے آزاد ہو چکا ہے، اور کسی بھی فرد انسانی کی تقدیر کے نظریہ کا سرگرم مخالف ہے، خواہ وہ انبیاء و رسل ہوں یا روحانی پیشوا، یا فکری رہنمایا کسی خاص مکتب فکر کے داعی، اور وہ ہر قسم کی اجارہ داری کا منکر ہے، وہ ملک بھی تعلیم و تربیت کے اصول کو عالمگیر انسانی اصول اور نوع انسانی کا مشترک سرمایہ تسلیم نہیں کرتا، اور اس کو ایسا صاف شفاف پانی نہیں سمجھتا جس میں رنگ آمیزی نہ کی جاسکے، اور کمیونسٹ حلقہ کے باہر سے کسی طرز تعلیم کو رد آمد کرنے؛ بلکہ ایسے علم و ادب کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا، جو۔ بقول سوویت روس۔ بورژوائی اور سرمایہ دارانہ

ماحول و معاشرہ میں پروان چڑھا ہو، جس کو سرمایہ داروں کے نظریات، رجحانات یا طرز تفکر سے غذا ملتی ہو، وہ گھبراتا ہے کہ ایسے علوم و فنون کہیں کمیونزم کے عقیدہ میں شک و شبہ نہ پیدا کر دیں اور اس کو کمزور نہ کر دیں۔

سوویت روس جو تمام حدود و قیود اور ہر طرح کی تقدیس و تقلید کے خلاف بغاوت اور کامل آزادی کا علم بردار کہلاتا ہے، اس نے بھی نظریاتی اور عملی تمام علوم و آداب، یہاں تک کہ سائنس، جغرافیہ اور تاریخ تک کو کمیونزم کے اصولوں اور اپنے قائدین اور اپنی دعوت کے مؤسسین کارل مارکس، انجلز اور لینن کے افکار و نظریات کے تابع کر دیا ہے، اور ان علوم و فنون اور ان رہنماؤں کی فکری بنیادوں میں باہم مضبوط اور مقدس تعلق قائم کر دیا ہے، اور اس معاملہ میں وہ اسی طرح حساس اور زودرنج ہے جیسے پرانے مومنین اپنے عقائد اور اپنے مقدسات، یا پرانے عرب اپنے اہل و عیال اور اپنی عزت کے بارے میں بہت ہی حساس ہوتے تھے، اور اپنی جان قربان کر دیا کرتے تھے، اور روسی بغیر کسی پس و پیش کے اور بلا جھجک اس کا اعلان بھی کرتے ہیں۔

سوویت روس کے ماہرین تعلیم میں سے صرف ایک کی شہادت یہاں کافی ہوگی، وہاں کا ایک ماہر طبعیات Mc Govern کہتا ہے:

”روسی علم عالمی علم کی قسموں میں سے کوئی قسم نہیں، بلکہ اس سے الگ اور مستقل بالذات علم ہے جو دوسری قسموں سے بہت مختلف ہے، کیونکہ سوویت علم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیادیں واضح اور ممتاز فلسفہ پر استوار ہیں، علمی تحقیقات کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہونی چاہیے، اور ہمارے علم کی بنیاد وہ مادی فلسفہ ہے جسے مارکس، انجلز، لینن اور اسٹالن نے پیش کیا، ہم چاہتے ہیں کہ طبعیاتی علوم کے میدان میں یہی فلسفہ لے کر داخل ہوں اور پوری قوت اور پامردی کے ساتھ ان تمام نظریات اور فلسفوں کا مقابلہ کریں جو ہمارے مادی، مارکسی فلسفہ سے ٹکراتے ہوں۔“

اسی بنا پر سوویت روس ضروری علوم اور اپنے تسلیم کردہ اصولوں میں تطبیق دینے میں کامیاب رہا، اور ان کو باہم مربوط کر کے ایک مکمل اکائی بنا دیا، اور اپنی طرز زندگی جس کے مطابق زندگی گزار رہا ہے، یا جس کی کوشش کر رہا ہے، اور ان اصول و مبادی کے درمیان جن پر کامل ایمان رکھتا ہے، پورے جوش و خروش کے ساتھ جس کی دعوت دیتا ہے اور جس کے لیے سخت لڑائیاں لڑ چکا ہے، کوئی خلا نہیں باقی رہنے دیا، اور اسی وجہ سے اس فکری اور نظریاتی اضطراب اور نفسیاتی خلجان سے محفوظ رہا جو دنیا کے بعض ایسے حصوں میں چھایا ہوا ہے جہاں متضاد اور متحارب ذہنیتیں اور طاقتیں انتشار پھیلا رہی ہیں، اور وہاں نفاق و شقاق کا دور دورہ ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام تعلیم

اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام زندگی اختیار کرنے والے ممالک اگرچہ مذہبی رواداری اور افکار و عقائد میں مطلق آزادی کے اصول کو اپنانے کی شہرت رکھتے ہیں، اور علم و سائنس کے میدان میں انسان کی عرق ریزی اور تجربات کے نتائج کو نوع انسانی کا مشترک اثاثہ سمجھتے ہیں اور ان سے استفادہ کرنا جائز؛ بلکہ ضروری قرار دیتے ہیں، وہ بھی بیرونی افکار و خیالات اور ایسے نظام تعلیم کی اجازت نہیں دے سکتے جو اشتراکیت اور انتہا پسند کمیونزم کا بیج بوتا ہو، اور انفرادی ملکیت اور اشتراکی اصولوں کے علاوہ دوسری بنیادوں پر سرمایہ کاری اور اس کی تنظیم کا مذاق اڑاتا ہو، اسی طرح اس کی بھی اجازت نہیں دے سکتے بلکہ اس کا خیال بھی دل میں آنے نہیں دیتے کہ کم سے کم تعداد میں بھی کمیونسٹ ممالک سے اساتذہ بلائے جائیں، خواہ وہ علمی تفوق اور فنی مہارت میں کسی بھی درجہ کو پہنچے ہوئے ہوں۔

محاملہ یہیں تک نہیں؛ بلکہ مغربی ماہرین تعلیم و تربیت کسی ملک سے بھی نظام تعلیم کی در آمد درست نہیں سمجھتے، خواہ وہ عقیدہ اور بنیادی افکار و نظریات میں ایک دوسرے سے کتنے ہی قریب کیوں نہ ہوں اور حیات و کائنات اور انسان کے بارے میں ایک ہی نظریہ کیوں نہ رکھتے ہوں، چنانچہ تعلیم و تربیت کے اصول نہ تو انگلینڈ فرانس سے لینے پر تیار ہے، نہ فرانس انگلینڈ سے لینا چاہتا ہے، حالانکہ دونوں صلح و جنگ کے رفیق و دمساز ہیں، اور ازلی بغض، ضد

اور صدر رکھنے والے ملک جرمنی سے یہ نظام مستعار لینا تو دور کی بات ہے۔
 انگریزی زبان، انگلوسکسن تہذیب و تمدن، متعدد سیاسی مصالحوں، دو عالمی جنگوں کی
 رفاقت، اور بڑی حد تک نسل و خون کی مشارکت نے برطانوی اور امریکی قوموں کو باہم دیگر
 بہت قریب کر دیا ہے، دونوں ممالک میں پرنٹسٹنٹ مذہب ہی کو غلبہ حاصل ہے، لیکن ان
 تمام تعلقات کے باوجود امریکہ میں تعلیم و تربیت کے نظریات اور پالیسیاں متعین کرنے
 والے نظام تعلیم برطانیہ سے مستعار لینا درست نہیں سمجھتے، ان کے خیال میں نظام تعلیم ایسی
 چیز ہے ہی نہیں کہ اس کو ضروریات زندگی، صنعتی مصنوعات یا خام مواد کی طرح ایک ملک سے
 دوسرے ملک میں درآمد کیا جائے، امریکی فاضل Dr. J. B. Conant اپنی کتاب
 Education and Liberty (تعلیم اور آزادی) میں لکھتا ہے:

”تربیت کے اصول و ضوابط، لین دین اور خرید و فروخت کی چیز
 نہیں، اور نہ کوئی ایسا سامان ہے جس کی درآمد برآمد کی جائے، ہم نے
 ماضی میں یورپی یا انگریزی تعلیمی نظریات کو امریکہ میں اختیار کر کے نفع
 سے زیادہ نقصان اٹھایا ہے۔“

اسلامی نظام تعلیم و تربیت

حضرات! ان ماہرین اور رہنماؤں کی نظر میں جو اپنی قومی خصوصیات اور اپنے ملک کے
 امتیازات کو اپنی جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں، تعلیم و تربیت کا نظام ایک ایسا لباس ہے جس کی قطع
 و برید قوموں کے قد و قامت، قومی خصائص، آبائی رسوم، اور ان بلند اقدار اور مقاصد کے مطابق
 ہونی چاہیے جن کو یہ اپنی حیات و موت کا حاصل سمجھتی ہیں، ایسا لباس ہے جس میں ماحول، آب و
 ہوا اور اس معاشرہ کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے جس میں قوم زندگی گزار رہی ہے، اس طرح ان
 کے اختیار کردہ اخلاق و عادات، ان کی تاریخ، جس پر وہ فخر کرتی ہے، اور اس مثالی کردار سے
 مطابقت بھی ضروری ہے جس پر وہ فریفتہ ہے، اور جس کی مدح سراہی کرتی رہتی ہے۔

ہم مسلمانوں کے لیے تو اور زیادہ ضروری ہے کہ آخری نبی ﷺ کے لائے ہوئے عقائد اور اس دین کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھیں جو مسخ و تحریف کی دست درازیوں سے محفوظ رہا اور جس پر انقلابات زمانہ کبھی اثر انداز نہیں ہوئے، جبکہ دوسرے مذاہب تغیرات زمانہ کا اثر قبول کرتے رہے اور انسانی تجربات ان میں ترمیم و تنسیخ بھی کرتے رہے، اس کی شہادت خود ان مذاہب ہی کی تاریخ سے ملتی ہے کہ وہ ہمیشہ انقلاب و تغیر اور انسانی اسباب و عوامل کے تابع رہے، اور پھر ان مذاہب میں بنیادی عقائد اور دین و بے دینی، کفر و ایمان اور اخذ و ترک کے حدود کو وہ اہمیت اور فیصلہ کن حیثیت حاصل نہیں جو ہمارے مذہب ہی عقائد کو حاصل ہے، بلکہ ان مذاہب میں کفر و ایمان کے مابین فرق و امتیاز کرنے والے حدود دوسرے سے ہیں ہی نہیں، جو ہمارے یہاں موجود ہیں، اور جن میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے ساتھ رعایت کی گنجائش ہے نہ کسی اہم ترین مصلحت کے پاس و لحاظ کی، دوسری قوموں میں عقائد اور مذہبی اقدار کہیں تو بہت زیادہ پکدار بلکہ سیال ہیں، کہیں بہت ہی مبہم اور غیر واضح، اسلامی عقائد ہی کی طرح اسلام کا مرقع بھی صاف و بے داغ ہے، اور اسلامی سیرت و کردار واضح خد و خال اور متعین حدود رکھتا ہے۔

اور جزيرة العرب اسلامی عقائد اور اسلامی سیرت و کردار میں دوسرے اسلامی ممالک کا صرف سہیم و شریک ہی نہیں، بلکہ اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ اسی کے سر ہے، کیونکہ وہی اس کا اولیٰ داعی اور اس کا دائمی محافظ اور اسلامی دعوت کا منبع و مخرج اور مجاوماویٰ ہے، رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث ہے: (إِنَّ الْإِيْمَانَ لِيَأْرِزُ إِلَى الْمَدِينَةِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ إِلَى جُحْرِهَا) (۱) ”دین سمٹا کر مدینہ ہی کی طرف آ جائے گا جیسے سانپ اپنے سوراخ میں سمٹ کر داخل ہو جاتا ہے۔“

اس لیے اسے دنیا کے کسی دوسرے ملک و قوم سے استفادہ کرنے کے بارے میں غیرت کا ثبوت دینا چاہیے، ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ تعلیم و تربیت، طرز تعلیم اور نصاب

(۱) رواہ البخاري في صحيحه، كتاب فضائل المدينة، باب الإيمان يأرز إلى المدينة، حديث رقم ۱۸۷۶۔

درس کا لباس اپنے قد و قامت کی ناپ پر تیار کریں، اور کسی بھی قوم و جماعت کے مقابلہ میں اپنے اصول و نظریات و مقاصد کے بارے میں زیادہ غیور، زیادہ ذکی الحس اور زیادہ وفادار ثابت ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ [سورة آل عمران: ۱۱۰] ”تم بہتر امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم کرتے اور برائی سے روکتے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔“

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [سورة البقرة: ۱۴۳] ”اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل قوم بنایا تاکہ تم لوگوں کے درمیان گواہ عادل کی حیثیت سے رہو۔“

لہذا ہم کو چاہیے کہ علوم و فنون، نظامہائے تعلیم و تربیت کے نظریات - خواہ وہ مغرب کے ساختہ پرواختہ ہوں یا مشرق کے پروردہ - یہ سمجھ کر قبول نہ کریں کہ یہی انسانی علوم کا معراج اور منجائے کمال ہے، اور اس کی تمام جزئیات و تفصیلات کے ساتھ اس کو قبول کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا تمام مشرقی اقوام پر فرض ہے، اور مقامی اثرات اور وقتی مصالح کے تقاضوں سے پاک کرنے کی بھی گنجائش نہیں، بلکہ انھیں یہ سمجھ کر قبول کرنا چاہیے - اگر قبول کرنا ضروری ہو - کہ یہ انسانی تجربات ہیں، جن میں خطا و صواب، کامیابی اور لغزش اور بصیرت و بے بصیرتی دونوں کا امکان ہے، ہمیں چاہیے کہ علوم و آداب اور مختلف زبانوں کو یہ سمجھ کر نہ اپنائیں کہ یہ اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں، اور ان پر ترقی و تکمیل کی ایسی مہر لگ چکی ہے جسے توڑا نہیں جاسکتا، بلکہ ہم ان علوم و فنون کو خام مواد کی طرح لیں اور اپنی ضرورت اور حالات کے مطابق جس شکل میں چاہیں ڈھال لیں، ان میں مخلوط فساد، الحاد اور اخلاقی اقدار کی تضحیک کرنے والے عناصر کو بلا کسی تکلف اور پس و پیش کے ان سے خارج کر کے ان کو صاف ستھرا اور پاکیزہ بنادیں، بلکہ ان میں ایمان باللہ اور اس ایمان کی روشنی میں حیات و کائنات کے متعلق گہری بصیرت کا قیمتی اضافہ کر دیں، اس طرح تمام علوم و فنون کو بغیر کسی دقت اور پریشانی کے علم و

حکمت کا وسیلہ اور ایمان و معرفت کا ذریعہ بنا کر اپنے آپ کو ارشاد خداوندی کا مصداق ثابت کر دیں: ﴿وَوَيْفَعَكْرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا﴾ [سورۃ آل عمران: ۱۹۱]، ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ [سورۃ فاطر: ۲۸] یہ موجودہ عالم اسلام کا بہت ہی اہم تجربہ ہوگا، موجودہ عمومی حالات جس کا تقاضا کر رہے ہیں، عالم اسلام میں برسرِ اقتدار تعلیم یافتہ طبقہ اور صحیح العقیدہ جمہور مسلمانوں کے درمیان برپا کشمکش بھی اسی کی متقاضی ہے، اور یہ ملک اس تجربہ کی تخم ریزی کے لیے بہترین کشت زار ثابت ہو سکتا ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سازگار حالات اور مناسب مواقع بھی مہیا کر دیے، کیونکہ اس پر ایسی حکومت سایہ گلن ہے جو ایک دینی دعوت کے طفیل وجود میں آئی ہے، جو دین خالص اور کتاب و سنت کو تمام انفرادی و اجتماعی معاملات میں جاری کرنے کی دعوت دیتی ہے، اور صرف اس انتساب کو اپنے لیے باعثِ صدا افتخار سمجھتی ہے۔

عقلی نابالغی

دنیا کی وہ قومیں جو سنِ رشد کو پہنچ چکی ہیں، جن کا شعور پختہ ہو چکا ہے، اور جو غلامی اور اندھی تقلید کی زنجیروں سے آزاد ہو چکی ہیں، ان کی نظر میں تعلیم و تربیت اب اصل مقصد نہیں ہے، بلکہ ان کی حیثیت اب اصل تک پہنچنے کے وسیلہ کی ہو گئی ہے، دنیا عقلی نابالغی کے دور میں بہت سی چیزوں کو اصل مقصد سمجھتی رہی، لیکن طویل تجربات اور انسانی عقل کی ترقیوں کے بعد اب وہ چیزیں بلند مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دی جا رہی ہیں، لہذا یہ کوئی انہونی بات نہیں کہ تعلیم و تربیت، مدرسوں، علم فن کے مرکروں، کتب خانوں اور نشر و اشاعت کے اداروں کو کسی زمانہ میں اصل مقصد کی حیثیت دی گئی ہو۔

لیکن مشرق پر یہی نابالغ ذہنیت اب تک مسلط ہے، ہم قوم کی ایک قابل لحاظ تعداد کو لکھنا پڑھنا سکھا دیتے ہیں، کسی علاقہ میں چند مدرسے اور کالج قائم کر دیتے ہیں، تو ہم سمجھتے ہیں کہ گوہر مقصود حاصل کر لیا اور اپنے فرض سے سبک دوش ہو گئے۔

لیکن مغرب جو تعلیم کا بہت شائق ہے، اور اس آخری دور میں پوری دنیا میں اس کا جھنڈا لہرا رہا ہے، جس کے اکثر ممالک اور علاقے غیر جانبداری، لامذہبیت بلکہ الحاد و بے دینی تک میں شہرت رکھتے ہیں، وہ بھی تعلیم کے نظام اور تربیت کے اصولوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا بے جان آلہ نہیں سمجھتا، اور نہ اسے ایسے منتشر اور بے جوڑ معلومات کو ایک سے دوسرے تک منتقل کرنے کا وسیلہ قرار دیتا ہے، جن کو باہم مربوط کرنے والی کوئی وحدت اور ان سب کو ایک نقطہ پر جمع کرنے والا کوئی مقصد نہ ہو، ان پر ایمان و عقیدہ کی گہری چھاپ نہ ہو، اور وہ نئی نسل کو اپنے اسلاف سے جوڑنے کا ذریعہ نہ بن سکے، بلکہ وہ بھی نظام تعلیم کو اسی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے کہ حاضر کو ماضی سے، نئی نسل کو اسلاف سے اور معلومات کو عقائد سے ملانے والا پیل ہے، اور موروثی عقائد و خیالات کے لیے علم و منطق اور دلیل و برہان کا مضبوط سہارا فراہم کرتا ہے، مغرب جس نظام تعلیم پر بے پناہ دولت صرف کر رہا ہے، اس کو وہ انتشار و تخریب کا نہیں بلکہ تشکیل و تعمیر کا عمل سمجھتا ہے، اور ذہنی و فکری خلجان و اضطراب اور باہم متصل کڑیوں کو توڑنے کا نہیں بلکہ اجتماعی زندگی میں باہمی تعلق و ارتباط اور افراد میں باہمی اعتماد کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔

مغربی مفکرین و ماہرین تعلیم کے رجحانات و افکار

یہاں موجودہ مغربی دنیا کے تین سربراہ اور وہ مفکرین اور ماہرین تعلیم کی رائیں نقل کی جا رہی ہیں، سر پیری لنن (Sir Percy Linn) جو برطانیہ کے ماہرین تعلیم میں سب سے ممتاز مقام رکھتا ہے، ”انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا“ کے ایک مقالہ میں لکھتا ہے:

”لوگوں نے تربیت کی تعریف متعین کرنے میں مختلف راہیں اختیار کی ہیں، لیکن ان تمام میں مشترک اصل اور بنیادی نقطہ یہ ہے کہ تربیت قوم کے بزرگوں اور تربیت دینے والوں کی اس کوشش کا نام ہے جو نئی نسل کو اپنے تسلیم و اختیار کردہ نظریہ زندگی کے مطابق ڈھالنے کے

لیے کرتے ہیں، اور ایک مدرسہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ طالب علم میں نظریہ زندگی سے تعلق رکھنے والے روحانی عوامل کو اثر انداز ہونے کا موقع فراہم کرے، اور طالب علم کی ایسی تربیت کرے کہ اس کے لیے اپنے قومی زندگی کی حفاظت اور اس کو آگے بڑھانا ممکن ہو سکے۔“

جان ڈیوی (John Dewey) موجودہ امریکی نظام تعلیم میں دوسرے ماہرین سے کہیں زیادہ اثر انداز ہوا ہے، اپنی کتاب ”جمہوریت اور تعلیم“ (Democracy And Education) میں لکھتا ہے:

”قومی تجدید کے سہارے زندہ رہتی ہیں، اور تجدیدی کوششوں کی بنیاد بچوں کی تعلیم پر قائم کی جاتی ہے، قوم مختلف طریقوں سے ناخواندہ افراد میں سے اپنے وسائل اور اپنے نظریہ زندگی کے لیے صالح ورثاء مہیا کرتی ہے، اور ان کو اپنے عقائد اور اصولوں کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔“

پروفیسر کلارک (Prof. Clark) کہتا ہے:

”تربیت کی تعریف و تشریح میں جو کچھ بھی کہا جائے، لیکن جس سے مفر نہیں، یہ ہے کہ یہ اس نظریہ زندگی کی حفاظت، اس کو مستحکم کرنے اور اگلی نسلوں تک پہنچانے کی جدوجہد کا نام ہے جس پر قوم پہلے سے ایمان لایا چکی ہے، اور جس کی بنیادوں پر قومی زندگی کی عمارت قائم ہے۔“

اسی نقطہ پر اسرائیل بھی سب سے زیادہ زور دیتا ہے، چنانچہ وہ اپنے تمام ترقی پسند رجحانات، ترقی یافتہ یورپی ممالک کے ساتھ ساتھ چلنے کی خواہش اور غیر ملکی زبانوں اور جدید علوم کے ماہرین کی بڑی تعداد رکھنے کے باوجود اپنے مذہبی شعور اور ثقافتی سرمایہ رکھنے والی عبرانی کو آگے بڑھانے میں تمام ممالک سے آگے ہے، ڈاکٹر راڈرک ماتھیوز (Dr. Roderick Matheios) اور ڈاکٹر متی عقراوی کی مرتب کردہ کتاب ”النریبۃ فی

الشرق العربي“ میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے:

”فلسطین کے اسرائیلی مدارس میں سب سے اہم اور قابل توجہ چیز یہ ہے کہ انگریزی، فرانسیسی اور عربی زبانوں کی تعلیم کے علاوہ تمام مضامین میں ذریعہ تعلیم عبرانی ہے، اور تعلیم کے تمام مراحل میں مذہبی تعلیم اور اس کو صہیونیت کی بقا و ترقی کی بنیاد بنانے پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔“

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیل کے تمام مدارس اور تمام پارٹیاں اور طبقے جن سے طلبہ کے سرپرست تعلق رکھتے ہیں، تعلیمی، مذہبی اور سیاسی خیالات اور قدروں میں باہمی اختلافات کے باوجود اس بنیادی نقطہ پر سب متفق ہیں، اور مذہبی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں، بعضوں کا خیال ہے کہ یہود کی مذہبی روایتیں ہی روشنی کا مینار ہیں، جن سے نظام تعلیم کے لیے روشنی حاصل کرنی چاہیے۔

ماہنامہ ”فلسطین“ میں ”اسرائیل میں اعلیٰ تعلیم“ کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے، اس کا مقالہ نگار (دائرة البحوث و الدراسات في الهيئة العربية العليا لفلسطین) فلسطین کے اعلیٰ عربی ادارے کے شعبہ تحقیق و مطالعہ کی تحقیقاتی رپورٹ کے حوالہ سے لکھتا ہے:

”اعلیٰ تعلیم میں جو سیاست کارفرما ہے، اس کا اصل مقصد ہے: یہودی عقیدہ کی ترویج و اشاعت، اور اس کے ساتھ محبت و تعلق میں اضافہ، ساتھ ہی اسرائیل کے لیے پروپیگنڈا اور اس کے لیے دوستوں کی تلاش۔!!“

اس مقالہ میں عبرانی زبان اور اس کی یونیورسٹیوں کی طرف غیر معمولی توجہ، ان کے بجٹ اور ان کے لیے یہود کی مساعی، ان پر خرچ ہونے والی بے حساب دولت اور ان کے لیے بہترین انتظامات کی حیرت انگیز تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں۔

اس فکر و خیال کی اصل بنیاد۔ جو تعلیم و تربیت کو قوم کے قبول کردہ عقائد، خیالات اور اقدار کو مضبوط کرنے اور ان کو اجاگر کرنے کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ یہ ہے کہ اصل معیار اور قابل لحاظ چیز ہے: والدین کا عقیدہ اور ان کا ارادہ، انہی کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ اپنے جگر گوشے، اپنے خواہوں اور خیالوں کے وارث اپنے بچے کے لیے نظام تعلیم منتخب کریں۔

بمبئی کی مسیحی تعلیمی اداروں کی انجمن نے بمبئی کی صوبائی حکومت کے خلاف وہاں کے ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا تھا، اور ہائی کورٹ سے درخواست کی تھی کہ صوبائی حکومت کو مسیحی لڑکوں کو ان کے والدین کی مرضی کے خلاف تعلیم دینے سے باز رکھے، اس درخواست پر وہاں کے چیف جج اور ایک دوسرے جج نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا تھا:

”جمہوریت میں ایک شہری کا سب سے قیمتی حق فکر و خیال کی آزادی ہے، اور اس میں اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ خیال پر کنٹرول کرنے کا سیدھا اور آسان طریقہ نوجوانوں کی تعلیم کو کنٹرول کرنا ہے، حکومت کسی باپ کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے بچے کو وہی تعلیم دلائے جسے حکومت مناسب سمجھتی ہو، انسانی حقوق کے چارٹر۔ جس میں ہندوستان بھی شریک ہے۔ کے آرٹیکل ۶ (۳) میں کہا گیا ہے کہ ”والدین کو پہلا حق ہے کہ وہ اس کا انتخاب کریں کہ ان کے بچے کو کس قسم کی تعلیم دی جائے۔“ (۱)

یہ مغربی اقوام، مسیحی عقائد سے جن کا تعلق بہت کمزور ہو گیا ہے، مسیح علیہ السلام کے دیے ہوئے اخلاقی اقدار کی جن کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رہی، جن میں مسلم اصولوں اور حقائق کے بارے میں بے اعتمادی پھیل گئی ہے، جب یہ قومیں اپنے نظام تعلیم کو اس خاص نقطہ نظر سے دیکھتی ہیں، اور اس سے زندگی میں اصول و عقائد میں استحکام پیدا کرنے اور فردو جماعت، عقل اور جذبات اور حاضر اور ماضی کے درمیان ربط و تعلق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا

کام لیتی ہیں، تو پھر مسلم اقوام اور اسلامی اور عرب ممالک اس سے یہ کام کیوں نہ لیں جبکہ ان کی پوری تاریخ میں کبھی علم و کلیسا اور مذہب و حکومت کے درمیان نام نہاد کشمکش بھی پیدا نہیں ہوئی، جہاں دین و سیاست میں فرق و امتیاز کا وجود ہی نہیں، جن کے نزدیک دین و مذہب افراد کی ذاتی زندگی تک محدود نہیں، اور جو تاریخ کے کسی دور میں بھی انتہا پسندانہ الحاد اور عمومی ارتداد کا شکار نہیں ہوئے۔

تعلیم فی نفسہ مقصد نہیں

ماضی قریب کی دو تباہ کن جنگیں۔ جن کی قیادت علم اور تہذیب و تمدن کے چوٹی کے لوگوں نے کی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ترقی یافتہ تعلیم صالح اخلاق، انسانیت کا احترام اور کمزور اقوام کے ساتھ عدل کا جذبہ پیدا کرنے میں قطعی ناکام رہی، امریکہ، یورپ، ہندوستان اور دوسرے متعدد مشرقی ممالک میں یونیورسٹیوں کے نوجوانوں کا اخلاقی بگاڑ، طلبہ کی قانون اور نظم و انصرام میں دست درازیاں اور طفلانہ خواہشات اور پست اغراض کی پیروی، یہ سب صاف بتا رہے ہیں کہ تعلیم فی نفسہ مقصد نہیں بلکہ وہ صرف ایک ذریعہ ہے، جو کامیاب بھی ہو سکتا ہے، ناکام بھی، نفع بخش بھی ثابت ہو سکتا ہے مضرت رساں بھی، اور تعمیر کا سامان بھی بن سکتا ہے اور تخریب کا ذریعہ بھی، اور جب وہ اخلاق کی عفت، صالح ذہنیت، صحیح عقیدہ اور مذہبی رجحان جیسے عناصر سے خالی ہوگا تو نقصان کا پہلو نفع سے کہیں زیادہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین اور ماہرین تعلیم کی نظر میں بھی تعلیم و تربیت یا لکھنا پڑھنا سکھانے کی فی نفسہ کوئی قیمت نہیں رہی، بلکہ اس کی قیمت کا اندازہ اس کے نتائج، تعلیم یافتہ افراد کے اخلاق اور معاشرہ کی تعمیر و ترقی میں ان کے کردار کے اعتبار سے کیا جائے گا۔

سطحی انداز فکر

ہمارے مشرقی ممالک میں تعلیم یا صحیح تر الفاظ میں لکھنے پڑھنے کی عظمت و اہمیت جتانے کے لیے کیے گئے زبردست پروپیگنڈا، اس میں مبالغہ اور حد سے تجاوز، اعلیٰ تعلیم و ثقافت کی

قدر و قیمت میں شاعرانہ خیال آرائی، اور جہالت کی مکروہ تصویر کشی اور جامعی تعلیم سے محروم افراد کی تحقیر و تضحیک، ان تمام اسباب و عوامل نے اعلیٰ تعلیم و ثقافت کو ایک طرح کا تقدس عطا کر دیا، جس کی وجہ سے لوگ بہت سے حقائق اور تعلیم یافتہ طبقہ کے عیوب کو نظر انداز کر جاتے ہیں، اور اکثر فریب خوردہ ذہن کے لوگ، شریف اور نیک جاہل پر، تعلیم یافتہ پست اخلاق مجرم کو ترجیح دیتے ہیں، اسی طرح اس ذہنیت والوں کے خیال میں اس زمانہ کے مقابلہ میں، جبکہ تمام دینی و اخلاقی فضائل و محاسن بکثرت پائے جاتے تھے، لیکن تعلیم یافتہ افراد کا تناسب کم تھا اور لکھنے پڑھنے کا رواج بھی زیادہ نہیں تھا، یہ زمانہ زیادہ ترقی یافتہ اور افضل ہے جس میں پڑھنے لکھنے کا رواج تو بہت ہو گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اخلاقی زوال، ذہنی انتشار اور اصول و مسلمات اور حقائق و بدیہیات میں شک اور بے اعتمادی میں بھی اضافہ ہوا ہے، جس کے نتیجے میں گرفتار ہو کر لوگ اپنے آپ اور اپنی اولاد تک سے غافل ہو گئے ہیں، دین و اخلاقی غیرت مفقود ہو گئی، اور مادہ انسانوں کا معبود بن گیا، یہ ذہن تعلیم اور ڈگریوں کی عظمت و اہمیت جتانے والے سطحی پروپیگنڈا کے سامنے عبرتناک شکست کا نتیجہ ہے، یہ بہت سطحی انداز فکر ہے، ذریعہ و مقصد میں فرق کرنے والے اور اخلاق اور اعمال صالحہ کی قدر و قیمت سمجھنے والے افراد کے فکر و نظر کو اس سے بلند ہونا چاہیے۔

ایک حقیقت

تاریخ بار بار یہ ثابت کر چکی ہے کہ جو قومیں ذرائع کو مقاصد کا درجہ دیتی ہیں، علوم و فنون کو قابل پرستش معبودوں کے مقام پر فائز کرتی ہیں، جن میں اخلاق و اعمال کے مقابلہ میں بحث و نظر کا رجحان بڑھ جاتا ہے، جمالیات سے دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا ہے، قوت ارادی کمزور پڑ جاتی ہے، غیرت و حمیت کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے، اور اس کے عقائد میں شکوک پیدا ہو جاتے ہیں، قدیم روایات کا مذاق اڑایا جاتا ہے، اور شکوک کا دائرہ مذہبی مآخذ، تاریخی مراجع، تاریخی شخصیات و واقعات اور رسوم و روایات تک بڑھ جاتا ہے، اور اس کی قیادت بڑے بڑے محققین، ماہر ادباء اور انشاء پرداز اور صحافی کرنے لگتے ہیں، اور یہ زہر قوم کے ہر

طبقہ میں پھیل جاتا ہے، اور نوجوانوں کی عقل و ضمیر میں سرایت کر جاتا ہے، تو یہ قوم کسی بھی مخالف طاقت اور حملہ آور دشمن کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتی، اور کسی معرکہ میں ایک دن بھی نہیں جم سکتی، یونانیوں اور رومیوں کی تاریخ سے یہی سبق ملتا ہے، اور مشرقی عرب کا المیہ بھی کوئی زیادہ دن کی بات نہیں۔

ہم کیا کریں؟

ہم کو چاہیے کہ ہم حقیقت پسندی کا ثبوت دیں، اور اعلیٰ تعلیم اور مغربی تہذیب کے بارے میں حقائق اور تجربات کی روشنی میں صحیح رائے قائم کریں، اسی کو تمام امراض کا واحد علاج نہ سمجھیں، اس کو کبریائی اور تقدس کا مقام نہ عطا کریں، بلکہ اس میں ایسے عناصر کا اضافہ کریں جو اس سے بگاڑ، الحاد اور اباحت کے عوامل کا اثر زائل کر دے، اور اس کو اپنی ثقافت، اسلامی کردار اور مشرقیت کے عناصر سے ہم آہنگ کر لیں، اور اپنے عالمی ابدی پیغام کے تابع بلکہ اس کا پاسبان بنالیں۔

ہمیں تعلیم و تربیت، تہذیبی منصوبہ بندی اور ہر پروگرام سازی کے وقت اس کا پورا شعور و احساس ہونا چاہیے کہ موجودہ جزیرۃ العرب محمد رسول اللہ ﷺ کا لگایا ہوا نہال سدا بہار اور ان کی اور ان کی اصحاب اور ان کی دعوت پر لیک کہنے والوں کی دعوت و جہاد ہی کا ثمرہ طیب ہے، اسی لیے اس پر انھیں کا حق ہے، اس لیے اس جزیرہ میں طے کیے جانے والے نظم و نسق، منصوبہ بندی اور یہاں قائم ہونے والے اداروں کو اسی اصول کا تابع اور اسی روح کا حامل ہونا چاہیے، رسول اللہ ﷺ اس کے شدت سے خواہاں اور اس کی اہمیت کو محسوس فرماتے تھے کہ یہ جزیرہ اسلام کا ناقابل تسخیر قلعہ بنا رہے، اور اپنے اصول پر مستحکم ہونے کے سبب ہر قسم کی دینی کشمکش اور فکری انتشار سے بچا رہے، چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ

: (لأخرجن اليهود و النصارى من جزيرة العرب حتى لا أذع إلا مسلما) (۱)

”میں جزیرۃ العرب سے یہود اور نصاریٰ کو نکال دوں گا، اور مسلمانوں کے سوا اس میں کسی اور کو نہ رہنے دوں گا۔“ اسی طرح آپ ﷺ نے امت کو یہ تاکید فرمائی کہ (لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب) (۱) ”جزیرۃ العرب میں دو دین نہ رہیں۔“

رسول اللہ ﷺ کی اس حکیمانہ بصیرت اور مصلحت آمیز تعلیم میں ان تمام عناصر سے جزیرۃ عرب کو پاک رکھنا شامل ہے جو اسلام کے اس قلعہ میں بغاوت، ارتداد اور اسلام کی فضیلت، اس کے پیغام کی ابدیت اور عومیت پر ایمان نہ رکھتے ہوں، اور فلاح و کامرانی کو اسی کے مطابق ایمان و عمل میں منحصر نہ سمجھتے ہوں۔

یہ حکیمانہ بصیرت اور دور رس اقدامات ہر اس چیز کو اس جزیرہ سے دور رکھنے پر مشتمل ہے جو اسلام کے اس قلعہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار الحکومت میں رذت و بغاوت، اسلام کے بارے میں بے اعتمادی، اس کے پیغام کی ابدیت و عالم گیری سے مایوسی اور اس سے انکار کا رجحان پیدا کرے۔

قبول دین کے معاملہ میں کوئی جبر و کراہ نہیں، اور اسلام کی تاریخ ان ”تحقیقاتی و احتسابی عدالتوں“ (محاکم التفتیش Courts of Inquisition) کے طریقوں سے آشنا نہیں، جن جن کے لیے قرون مظلمہ (Dark Ages) کا یورپ مشہور و بدنام ہے، لیکن اس کے باوجود اس جزیرہ میں۔ جسے اسلام کے اصل مرکز اور قلب کی حیثیت حاصل ہے۔ انارکی، انتشار، لاقانونیت، تشکیک، ضعیف الاعتقادی اور اسلامی عقائد و اصول سے بد اعتمادی پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اور اسلام کی راجدھانی اور اسلامی دعوت کے گہوارہ اور اسلام کی فوجی چھاوٹی میں رہ کر کسی کو مخالف طاقتوں اور اجنبی قوتوں کا گمراہ کن پروپیگنڈہ کرنے اور ان کا ایجنٹ اور آلہ کار بننے کی آزادی نہیں بخشی جاسکتی، اس لیے اسلام کی ابدی صداقت اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت، آپ کی عالمگیر اور ابدی امامت و قیادت کے بارے میں جو شرح صدر نہیں رکھتا اور وہ غیر اسلامی فلسفوں اور نظریوں پر عقیدہ

(۱) رواہ الإمام مالک فی الموطا عن ابن شہاب مرسلًا، کتاب الجامع، باب ما جاء فی

إجلاء اليهود من المدینة، حدیث رقم ۱۵۹۰

اور ان کے لیے حمیت رکھتا ہے، تو اس کے لیے فی الحقیقت اس جزیرہ میں کوئی جگہ نہیں، اور نہ یہ جائز ہے کہ اس کو اپنے خیالات کی تبلیغ کے مواقع فراہم کیے جائیں، اور نئی نسلوں کے ذہن و فکر کی تربیت و رہنمائی کا کام سپرد کیا جائے، اور یہ کسی طرح درست نہیں کہ اس جزیرہ کے لخت جگر اور نور نظر نوجوانوں کو ایسے شخص کے سپرد کر دیا جائے کہ وہ ان کو ان سانچوں میں ڈھالے جو اس جزیرہ کے بنیادی عقیدہ و دعوت سے مختلف ہوں۔ جس کے لیے یہ جزیرہ ہزار سال سے زائد سینہ سپر رہا ہے، اور جس کے سبب عالم اسلام ہر دور میں اس کا کلمہ پڑھتا اور اس کی عقیدت و محبت کا دم بھرتا رہا ہے، خدا کی زمین بہت وسیع ہے، ایسے شخص کو دنیا میں کہیں اور اپنی جگہ تلاش کرنی چاہیے، ہر زمین عرب میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔^(۱)

(۱) ہفت روزہ ”ندائے ملت“، (لکھنؤ) خصوصی اشاعت ”تعلیم نمبر“۔

نظام تعلیم میں نظر ثانی کی ضرورت^(۱)

تعلیم کے مسئلہ پر اظہار خیال کے لیے وسیع تجربہ رکھنے والے جمع ہیں، اس وقت کے حاضرین کی ادنیٰ تحقیر یا حق تلفی کے بغیر میں اپنی طرف سے نہیں، بلکہ اس مسئلہ کی طرف سے یہ شکایت کرتا ہوں، اپنے دوستوں کی شکایت کرتا ہوں اور اپنی بھی شکایت کرتا ہوں، اس کو قبول کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ اس سے زیادہ وقت کا طالب تھا، اور اس سے زیادہ اطمینان اور سکون کی فضا کا متقاضی تھا۔

تعلیم کا مسئلہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے

تعلیم کا مسئلہ اپنے اندر پہاڑی دریاؤں اور آبشاروں جیسا شور نہیں رکھتا، اس کے لیے وقت اور مقالات و تقاریر کی پیمائش کے لیے کوئی فیتہ مناسب نہیں ہے، جس سے اس کو ناپا جائے اور مقرروں کو اس کا پابند بنایا جائے، اس کے لیے تو ایک علمی مذاکرہ یا خاص قسم کا سیمینار یا سمپوزیم مناسب تھا، آپ حضرات اس کانفرنس کی نشستوں اور مختلف جلسوں میں شرکت کر کے تھک گئے ہیں، اس کے لیے یہ وقت بھی مناسب نہیں ہے، اس صورت میں تعلیم جیسے سنجیدہ اور غور طلب مسئلہ پر غور کرنے کے لیے وہ مناسب ماحول اور پرسکون فضا میسر نہیں ہے جو اس کا حق ہے۔

(۱) ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں منعقدہ ایجوکیشن کانفرنس میں یونس سلیم صاحب (سابق گورنر بہار، سابق مرکزی وزیر حکومت ہند) نے عربی مدارس کو آڑے ہاتھوں لیا اور جی بھر کے تنقید کی، وہ اس وقت نائب مرکزی وزیر تھے، حضرت مولانا آس اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے، حضرت مولانا نے اس کے بعد یہ تقریر فرمائی جس میں انھوں نے یونس سلیم صاحب کی پیدا کردہ غلط فہمیوں اور تنقیدوں کا مسکت جواب دیا۔

نظام تعلیم کی ثنویت

میرے محترم دوست یونس سلیم صاحب نے ایک ایسا مسئلہ اٹھایا ہے جو بڑا اہم ہے، وہ نیا تو نہیں ہے، لیکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے تازہ ضرور ہے، اور غور طلب ہے، وہ ہمارے نظام تعلیم کی دوئی یا ثنویت ہے؛ یعنی دو متوازی نظام تعلیم کا کسی ملک یا معاشرہ میں نافذ ہونا، اس معاشرہ کی سب سے بڑی بد قسمتی ہے، اور یہ اس کو بہت غیر ضروری مشکلات میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی ہے، اس مسئلہ پر ہندوستان کے اہل فکر نے، اور ہندوستان کے باہر مشرق وسطیٰ کے مفکرین نے اظہار خیال کیا ہے، میری ناچیز تصنیفات میں بھی اس پر اظہار خیال موجود ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندوستان میں سب سے پہلے مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی نے اس مسئلہ پر اظہار خیال فرمایا، ۱۹۵۷ء میں جب مجھے مصر جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے ایک عرب فاضل اور بڑے تجربہ کار معلم ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے پہلی مجلس اور پہلی ملاقات میں اس پر گفتگو کی، حقیقتاً یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر بہت اطمینان کے ساتھ تبادلہ خیال ہونا چاہیے، میں یونس سلیم صاحب کی معلومات میں اضافہ کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا، لیکن شاید اپنے بہت سے سامعین اور حاضرین کی معلومات میں اضافہ کر سکوں کہ ہمارا قدیم نصاب تعلیم اس عیب سے بری تھا۔

درس نظامی

آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں جو نظام تعلیم کئی صدی تک چلا اور جس کو آخری دور میں درس نظامی سے موسوم کیا جانے لگا، اس کو ترکیستان و ایران میں بھی قبول کیا گیا، اس میں بھی کسی قسم کی تقسیم نہیں تھی، وہ نظام تعلیم یہاں ہر قسم کی ضرورت کے اشخاص پیدا کرنے کا ذمہ دار تھا، یعنی وہ جہاں علماء و فقہاء اور مفتی پیدا کرتا تھا، اور اس وقت کی سلطنت کو قاضی اور ماہرین فقہ مہیا کرتا تھا، وہاں ایڈمنسٹریشن اور سول سروس کے ماہرین بھی تیار کرتا تھا، اس نظام تعلیم کے علاوہ کوئی دوسرا نظام تعلیم اس ملک میں موجود نہیں تھا جو خاص قسم کے اشخاص پیدا کرے، ان تمام تمدنی، تعلیمی، اخلاقی اور اجتماعی ضروریات کے لیے ایک ہی نظام تعلیم پر انحصار تھا، لیکن یہ صورت حال انگریزوں

کے داخلہ کے بعد قائم نہیں رہی، اور ظاہر ہے کہ وہ اس نظام تعلیم کو قبول نہیں کر سکتے تھے، وہ ایک نیا نظام تعلیم اس ملک کے لیے لائے، اور اب تقریباً دنیا کے تمام ممالک میں دو متوازی نظام تعلیم جاری ہیں، یہ ذہنی انتشار اور جو کھٹکش آپ کو معاشرہ میں نظر آتی ہے، جس کے مظاہر ہم کو زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آتے ہیں، یہ اس دوئی اور اسی دو متوازی نظام تعلیم کا نتیجہ ہیں۔

ساری دنیا کا نظام تعلیم اصلاح طلب ہے

ہمارے دوست یونس سلیم صاحب نے ہمارے دینی نظام تعلیم پر ہمدردانہ لیکن ناقدانہ - حس کا ان کو ہر وقت حق حاصل ہے۔ اظہار خیال فرمایا، میں اس پوزیشن کو ہرگز گوارا نہیں کروں گا اور نہ اپنے لیے مناسب سمجھتا ہوں اور نہ ان کے لیے کہ میں کوئی دفاعی موقف اختیار کروں، یا ان کے اٹھائے ہوئے بعض سوالات کا جواب دوں، لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ جہاں تک نظام تعلیم کا تعلق ہے، تقریباً ساری دنیا کا نظام تعلیم اصلاح طلب ہے، وہ بڑی حد تک اپنی افادیت کھو چکا ہے۔

آپ امریکہ و یورپ اور دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں دیکھیں گے، نہ صرف نظام تعلیم سے بلکہ نظام تعلیم کے بنیادی تختیل سے عام بے چینی پائی جاتی ہے، اور یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ یہ نظام تعلیم اب بہت کچھ فرسودہ اور Out of Date ہو چکا ہے، ان میں ہمیں نئی روح ڈالنی چاہیے، اور از سر نو اس کی تشکیل ہونی چاہیے، لیکن ابھی تک دنیا کے کسی حصہ میں بھی کوئی ایسا انقلابی اور جرأت مندانہ قدم نہیں اٹھایا گیا، اور یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو بغیر سوچے سمجھے رواں دواں ہے۔

معاشیات و سیاسیات کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ

اس عہد میں معاشیات اور سیاسیات نے اتنی اہمیت اختیار کر لی ہے اور وہ فکری قومی اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اس طرح حاوی ہو چکے ہیں کہ تعلیم کا مسئلہ جس توجہ کا مستحق تھا، اتنی توجہ اس پر نہیں کی گئی۔

علامہ اقبال کا نظریہ

جہاں تک تقلید اور فرسودگی و کہنکی کا تعلق ہے، اور جہاں تک اصلاح طلب ہونے کا سوال ہے، اس میں جدید اور قدیم نظام تعلیم کا کوئی فرق نہیں ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبال مرحوم نے اپنا جب یہ مصرع کہا تھا:

کند مکتب رہ طے کردہ راطے

تو اس سے مراد کوئی قرآنی مکتب نہیں تھا جو مسجد میں کام کرتا ہے، بلکہ آپ کو معلوم ہے کہ ان کی اصطلاح ”دانش گاہ“ کے لیے مکتب اور مدرسہ کی ہے، وہ جب مکتب کا لفظ بولتے ہیں تو ان کی مراد دانش گاہ ہوتی ہے، تعلیم دینے کا مرکز، خواہ وہ کوئی یونیورسٹی اور کالج ہو، یا عربی کا مدرسہ اور دارالعلوم۔

اقبال نے آج سے نصف صدی پہلے جو بات بہت سادے الفاظ میں کہی تھی:

کند مکتب رہ طے کردہ راطے

مکتب سے جو سبق روز اول سے پڑھا تھا ابھی تک وہ اس کو دہرائے چلا جا رہا ہے، جو راستہ طے ہو چکا ہے وہ اس کو طے کر رہا ہے، یہ صورت حال کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

اقبال کے الفاظ میں ایک شکوہ

جہاں تک نظام تعلیم کا تعلق ہے وہ ایسے Radical Change، ایسے بنیادی انقلاب اور ایک ایسے جرأت مندانہ اقدام کا طالب ہے جس کے اندر جرأت بھی ہو، ذہانت بھی ہو، وسعت بھی ہو، میں اقبال کے الفاظ میں شکوہ کروں گا اور کم سے کم جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، یہ عرض کروں گا:

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے	نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق
حلقہ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں	ہائے محکومی و تقلید و زوال تحقیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب	کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

تو واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جہاں تک عربی مدارس کا تعلق ہے، میں اس کا ایک حقیر خادم ہوں، مجھے یونس سلیم صاحب کے گلہ کا کوئی گلہ نہیں، میں ان کے ان تعلقات سے واقف ہوں جو نہ صرف مدارس سے؛ بلکہ ان کے خادموں سے ہیں، اور آج کے نہیں، بہت دیرینہ ہیں، میں ان کے اس گلہ کو قبول کرتا ہوں کہ ان مدارس میں تبدیلی کی ضرورت ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ پورا نظام تعلیم از سر نو بدلنے کے قابل ہے، اور کوئی شخص جس کی زندگی پر نظر ہے، زندگی کے بدلتے ہوئے وسائل اور اس کی تیز رفتاری پر نظر ہے، وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ جس طرح سے قدیم مدارس زندگی سے الگ ہو گئے ہیں، وہ زندگی سے کچھ زیادہ ہم آہنگ نہیں ہیں، اسی طرح ان یونیورسٹیوں کے گریجویٹ اور فضلاء زندگی میں اپنا وہ مقام معین نہیں کر سکے اور اپنی افادیت کا ایسا ثبوت نہیں دے سکے جتنا ثبوت انھیں دینا چاہیے۔

اسلامیات پر مزید توجہ کی ضرورت

جہاں تک تعلق ہے اسلامیات پر کام کرنے کا، میں یہ عرض کروں گا کہ اس وقت تک اس پر بہت کچھ کام ہو چکا ہے، بے شک مسئلہ کی نوعیت ایسی ہے کہ کسی کام کو حرف آخر نہیں کہا جاسکتا، یہ زندگی کی تعریف ہے، کوئی برائی یا عیب نہیں، اسی سے زندگی زندگی کہلانے کی مستحق ہے، کہ وہ کسی جگہ ٹھہرتی نہیں، وسائل اور اس کے مطالبات بدلتے رہتے ہیں، ان کے جواب دینے کی ضرورت ہے، میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ انھوں نے صورت حال کی جو تصویر پیش کی ہے، اس میں حقیقت کم ہے، اور شاید وہ ان کام کرنے والوں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکے، ایسا نہیں ہے، ان مسائل پر بہت وقیع لٹریچر پیدا ہو گیا ہے، لیکن ان کی اشاعت اور پہنچائی کا کام جس پیمانہ پر ہونا چاہیے، اس میں ضرور کمی ہے۔

ہمارے علماء کے متعلق آج سے پچاس برس پہلے جو الفاظ کہے گئے تھے، بعینہ آج بھی دہرا دیے جاتے ہیں، دودن سے سن رہا ہوں اور میرے کان میں جو الفاظ پڑے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں نے اپنے حافظہ پر زیادہ اعتماد کیا ہے، اور ذہن پر کم، مجھے افسوس ہے کہ ہمارے بہت سے احباب پوری صورت حال سے واقف نہیں ہیں، وہ نہیں جانتے کہ کن کن

گوشوں میں کیسی کیسی کوششیں کی جا رہی ہیں، جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے، ان کی تردید یا ان کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب میں بہت فکر انگیز لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، اس کا جائزہ لینا بھی بڑا اہم کام ہے، جو ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ ان چیزوں کو بالکل اچھوت چھوڑ دیا گیا ہو اور ان کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی، کہ ندوۃ العلماء بے شک اپنے مقاصد میں اس حد تک کامیاب نہیں ہو سکا جس حد تک اس کے روشن ضمیر بانیوں نے سوچا تھا، اس کے بہت سے تاریخی، اقتصادی اور سیاسی اسباب ہیں، کوئی شبہ نہیں کہ اس نے یہ آواز بلند کی تھی، وہ آواز اب بھی بڑا وزن رکھتی ہے، اور باوجود اس کے کہ اس پر ستر برس گزر چکے ہیں، اس میں کہنگی اور فرسودگی پیدا نہیں ہوئی، یہ ایک داستان ہے جو کبھی فرصت سے سنائی جائے گی۔

نظام تعلیم کے لیے ایک نئے اجتہاد کی ضرورت ہے

میں یہ عرض کروں گا کہ نظام تعلیم کے لیے ایک نئے اجتہاد کی ضرورت ہے، اور اس اجتہاد کا دامن صرف دینی مدارس تک محدود نہیں رہنا چاہیے، بلکہ پورے نظام تعلیم کو اس کو اپنے سایہ عاطفت میں لینا چاہیے، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ انسانوں کے لیے جو چیز پیدا کی جائے وہ کسی زمانہ میں بھی حرف آخرنہیں ہو سکتی، یہ صرف وحی الہی کی خصوصیت ہے، باقی یہ مشرق کی خصوصیت ہے نہ مغرب کی، اور قدیم و جدید کی تقسیم میں اقبال کے الفاظ میں دلیل کم نظری ہے، اس میں مشرق و مغرب کی کوئی تخصیص نہیں، اسلام ایک ابدی پیغام ہے، اس کا زندگی سے تعلق ہے، اور جس چیز کا زندگی سے تعلق ہو اس کو زندگی کا ہر وقت جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور تعلیم کے پورے مسئلہ کو اپنی نگرانی اور احتساب میں لینا چاہیے، اور اس میں کسی کی رعایت نہ کرنی چاہیے۔

فن تعلیم اور نظام تعلیم کے اصول

جہاں تک فن تعلیم اور اس کے اصولوں کا تعلق ہے، میں ان محنتوں کی قدر کرتا ہوں جو تعلیم کے اصول اور نظام تعلیم کے آداب اور تجربات کے بارے میں کی گئی ہیں، جو کتب خانہ

اصول تعلیم پر اس وقت تک تیار ہو گیا ہے، وہ ہمارے قدر و اعتراف کا مستحق ہے، لیکن فن تعلیم وہ بحث و موضوع ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا، اس میں پرانے تجربات اور رہنما اصولوں سے زیادہ عقل سلیم (Common Sense) اور اس مسئلہ سے مناسبت کی ضرورت ہے۔

اگر کسی جگہ تمام ماہرین تعلیم جمع ہو جائیں اور انھیں اس موضوع پر اظہار خیال کا موقع دیا جائے، تب بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے اس مسئلہ کا احاطہ کر لیا ہے، اس کو تو بہر حال ہمیں معلمین اور اساتذہ کے ذوق سلیم، اپنے موضوع سے محبت اور شیفتگی پر اور نوجوانوں کی نفسیات شناسی پر چھوڑنا پڑے گا، اور اسی پر اعتماد کرنا پڑے گا، یہ تعلیم کس طرح ہو؟ کس طرح اپنے موضوع کی محبت پیدا کر دی جائے؟ جس مذہب کی تعلیم دی جا رہی ہے، اس مذہب سے کس طرح وابستگی پیدا کی جائے؟ اور ان کے اندر کس طرح اس مذہب پر اعتقاد راسخ کیا جائے؟ کس طرح ان کی سیرت کی تشکیل ہو اور ان کا کیر کٹر بنایا جائے؟ کس طرح ان کو نفس کی مادی ترغیبات اور زمانہ کے خارجی اثرات سے بچایا جائے؟ مادیت اور دین و ایمان کے درمیان جو ایک عالمگیر معرکہ درپیش ہے، ان کے اندر کس طرح ایسی قوت پیدا کی جائے کہ وہ اس معرکہ سے کامیاب ہو کے نکل سکیں؟

استاد کو فن تعلیم سے فطری مناسبت ہو

اس کے لیے کسی اصول تعلیم پر لکھی ہوئی کسی ایک کتاب پر انحصار نہیں کیا جاسکتا، اس میں دو چیزوں کی شرط ہے:

ایک تو یہ کہ استاذ کو فن تعلیم سے فطری مناسبت اور خداداد ذوق ہو، وہ معلم پیدا ہوا ہو، اور اگر وہ معلم پیدا نہیں ہوا تو کم از کم اس نے اپنے موضوع سے اتنی مناسبت پیدا کر لی ہو کہ اس کو انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہ ہو۔

استاد مجتہد ہو

یہ اصول ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے، اور قیامت تک تسلیم کیا جائے گا کہ معلم درحقیقت مجتہد

ہوتا ہے، اسکولوں میں دینیات کے لیے لگے بندھے اصول ہمیشہ کام نہیں دے سکتے، اور نہ استاد کو آپ اس کا پابند بنا سکتے ہیں، استاد میں دل و دماغ سے سوچنے اور راستہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے، وقت پر اس کو ایسا معلوم ہو کہ الہام ہوا ہے، مجھے ایک عرب ماہر تعلیم کا یہ جملہ بہت پسند آیا: ”لَا يَكُونُ الْمُعَلِّمُ مُعَلِّمًا حَتَّىٰ يَكُونَ مُلْهَمًا“، کوئی استاد اس وقت تک حقیقی معلم اور استاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کو القانہ ہوتا ہو، اس کو یہ نہ محسوس ہوتا ہو کہ کوئی چیز اس وقت اس کے دل میں ڈالی گئی ہے، اس لیے کسی استاد کو محض طفل مکتب فرض کر لیا جائے کہ وہ ہر چیز دیکھ کر عمل کرے، پہلے وہ کتاب دیکھے پھر بچوں کو یا طلبہ کو پڑھائے، اس بارے میں تو خود اس پر اعتماد کرنا پڑے گا، اگر اس میں بات میں بات پیدا کرنے اور اپنا راستہ خود نکالنے کی صلاحیت نہ ہو، تو وہ کبھی کامیاب استاد نہیں ہو سکتا۔

استاد داعی ہو

دوسری شرط یہ ہے کہ استاذ داعی ہو، جس موضوع کی تعلیم وہ دینا چاہتا ہے، وہ اس کا مجسم نمونہ ہو، ان کی زندگی اس کا پرتو ہو، بلکہ زندگی اس کا پرتو کامل ہو، وہ جب سامنے آئیں تو معلوم ہو کہ مسلمان ایسا ہوتا ہے، ایک معلم اخلاق ایسا ہوتا ہے، ایک ایثار پیشہ آدمی ایسا ہوتا ہے، ایک پاکباز اور نیک سیرت انسان ایسا ہوتا ہے، ان کی تلقین اور عمل میں کلی مطابقت ہو، اور ان کے چہرے کا نور بتاتا ہو کہ وہ سراپا عصمت و صداقت ہیں، یہ سراپا اخلاص ہیں، ان کے علم میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی۔

کامیاب معلم

ایک مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم سے، جب کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، میں نے یہ عرض کیا تھا کہ مجھے ہمیشہ سے اس کے بارے میں بڑا تر دد رہا کہ دینیات کے لیے ایسے معلمین کا انتخاب کیا جائے جو معاشی اور علمی حیثیت سے پسماندہ ہوں، زندگی کے دھارے سے بالکل الگ ہوں، اور یہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ دینیات کے سوا کچھ نہیں

جانتے، ایسے مولویوں کا انتخاب کیا جائے جن کا معاشرہ میں بھی کوئی اونچا مقام نہ ہو، اور نوجوان ان کو زندگی سے علاحدہ دیکھتے ہوں، اور ان کا کوئی خاص احترام نہ ہو، زندگی کے مسائل سے بھی ان کو کچھ زیادہ ربط نہ ہو، میں نے کہا کہ اگر آپ کو فلاسفی ڈپارٹمنٹ یا آرٹس اور سائنس ڈپارٹمنٹ سے ایسے اساتذہ مل سکیں جو اسلام پر پورا عقیدہ رکھتے ہوں، دینیات سے بقدر ضرورت واقفیت رکھتے ہوں، وہ زیادہ اثر انداز ہو سکتے ہیں، مجھے یہ معلوم ہے کہ مسئلہ اس آسانی سے طے کرنے کا نہیں ہے، اس میں بہت سی عملی، تکنیکی اور وقتی دشواریاں ہیں، ان پر بحث کرنے کے لیے زیادہ وسیع وقت چاہیے۔

میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ معلمین کے انتخاب میں اس بات کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان کا نہ صرف اخلاقی اثر ہو بلکہ ان کا ذہنی تفوق بھی قائم ہو، وہ مسائل کو سمجھتے ہوں، زندگی کے مسائل سے باخبر ہوں، وہ زندگی کے کنارے نہ ہوں بلکہ بیچ منجد ہار میں ہوں، وہ عہد گذشتہ کے انسان نہ ہوں، بلکہ اسی عہد اور اسی دور کے انسان ہوں، اگر ادب و شاعری اور فنون لطیفہ کا مسئلہ چھڑ جائے، سیاسی مسئلہ موضوع بحث ہو، تو اس پر وہ آزادانہ رائے دے سکیں اور اپنی واقفیت کا نقش قائم کر سکیں، اور ان کے دل و دماغ میں ایک چنگاری فروزاں ہو، وہ طالب علم کو اپنا جیسا بلکہ اپنے سے اچھا بنانا چاہتے ہوں، ان کی غذا، ان کی دوا، ان کے دل کی تسکین اور ان کی زندگی کے لیے جواز ہی یہ ہو کہ وہ اپنے عقیدہ کو اپنے عزیز طلبہ، اپنے لخت جگر جو ملت کے لخت جگر ہیں، ان میں منتقل کر دیں، ان کو اگر روکا جائے اور ان کے پاؤں میں بھاری بیڑیاں ڈال دی جائیں اور ان کی زبان پر مہر لگا دی جائے، پھر بھی وہ بیتاب ہوں، اس بت خانہ میں اذان دینے اور اس صنم کدہ میں حق کی آواز بلند کرنے کے لیے۔

اگر ہمارے اساتذہ ایسی بے چین روح اور ایسا بیتاب جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں، اتنی غیر محدود صلاحیت کے مالک ہیں، ان کا رشتہ تعلیم سے براہ راست ہے، تعلیم نے ان کے کانوں میں اپنا راز کہا ہے، اور خدا کی مدد ان کے ساتھ شامل ہے، اور اپنے کو اس کا نمائندہ سمجھتے ہیں، تو وہ کامیاب معلم ہیں، ہزار آندھیاں چلیں، الحاد کے طوفان اٹھیں، کیسے کیسے

زلزلے آئیں، لیکن ان کا جلایا ہوا چراغ روشن رہے، جیسے اقبال نے کہا ہے:
 ہوا ہے گو تیز و تند لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
 وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

دینیات کی تعلیم کی کامیابی کا سب سے بڑا راز

سارے ضوابط، ساری اصطلاحات اور فن تعلیم کی ساری موشگافیاں ایک طرف اور یہ جذبہ بے تاب، یہ بے چین روح اور غیر محدود صلاحیت ایک طرف، جس طرح آگ اپنا کام کرتی ہے اور پانی کا سیلاب اپنا راستہ خود پیدا کر لے گا، یہ ہے دینیات کی تعلیم کی کامیابی کا سب سے بڑا راز، ایسے لوگوں کو کچھ سکھانے کی ضرورت نہیں، ایسے لوگ اپنے فن کے معلم نہیں معلم ہوتے ہیں، ایسے لوگ اپنے فن میں مقلد نہیں مجتہد ہوتے ہیں، ایسے لوگ اپنے فن میں پیرو نہیں امام ہوتے ہیں، آج ہندوستان میں اسی قسم کے معلمین کی ضرورت ہے، آپ ان لوگوں کی زندگی کی کہانی پر ہمیں جنھوں نے دنیا میں کچھ کام کیا، اور اپنے زمانہ کو کچھ پیغام دیا، جنھوں نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے اندر بے چینی پیدا کر دی ہے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ انہی اساتذہ کے احسان مند ہیں، جنھوں نے ان کے اندر یہ چنگاری روشن کر دی۔

آپ تعلیم کے مسئلہ پر آزادی کے ساتھ اظہار خیال کریں، تھوڑی دیر میں ہمارے فاضل مقالہ نگار اپنی زندگی کے تجربات آپ کے سامنے رکھیں گے اور مختلف نقطہ ہائے نظر آپ کے سامنے آئیں گے، آپ ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، آپ ان کو موقع دیں کہ وہ اپنے خیالات پیش کریں۔ آخر میں پھر عرض کروں گا کہ معاملہ بہت غور طلب ہے، وہ اتنا سرسری نہیں کہ چند پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کسی خاص مکتب فکر کا شکوہ کریں کہ انھوں نے زمانہ کا ساتھ نہیں دیا، معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

از سر نو نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت

اس وقت ساری دنیا میں ایک تعلیمی بے چینی پائی جاتی ہے، اگر ہمارے سیاسی رہنماؤں کو

ان کے سیاسی مشاغل فرصت دیتے، ان کے اندر یہ اخلاقی جرأت ہوتی تو اس پورے نظام تعلیم کی ازسرنو اور ہانگ کرتے، عربی مدارس کے ایک وکیل کی حیثیت سے میں یہ بات نہیں کہہ رہا ہوں، میرے لیے کوئی معذرت کی بات نہیں؛ بلکہ ایک ایسے حقیقی انسان کی حیثیت سے جو زندگی کے میدان سے کنارہ کش نہیں، کہ پوری دنیا کا نظام تعلیم اپنی افادیت بڑی حد تک کھو چکا ہے، اور یہ دنیا کی بڑی بد قسمتی ہے کہ سیاسی نقطہ نظر اور معاشی مسائل ہمارے قومی رہنماؤں پر اتنے حاوی ہیں کہ ان کو تعلیم کے بنیادی مسائل پر سوچنے کی فرصت نہیں، اور اگر کسی کو فرصت ہوتی ہے تو اس کو اس بارے میں جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی توفیق نہیں۔

کیمبرج اور آکسفورڈ میں تعلیمی قدامت

ہمارا پورا نظام تعلیم عرصے سے لکیر کا فقیر بنا ہوا ہے، اس میں عربی مدارس کی تخصیص نہیں، میں نے کیمبرج اور آکسفورڈ کو دیکھا، اور میں قصداً وہاں گیا، ایک معلم کی حیثیت سے گیا، ایک زائر و سیاح کی حیثیت سے نہیں، میں آپ کے سامنے شہادت دیتا ہوں کہ میں نے وہاں کے بہت سے شعبوں میں قدامت پائی، اور آج ہمارا معاملہ کیمبرج اور آکسفورڈ کے نقش قدم پر بھی نہیں ہے، اس کے بھی کامیاب اور صاحب شعور مقلد نہیں۔

ہندوستان کا نظام تعلیم نہ مشرقی ہے نہ مغربی

ہمارے ہندوستان کا نظام تعلیم نہ مشرقی ہے نہ مغربی، نہ قدیم نہ جدید، آپ قدیم نظام تعلیم کی شکایت کریں، میں اس کا وکیل نہیں، میرا تعلق اس حلقہ سے ہے جس نے قدیم نظام تعلیم کے مقابلہ میں ایک جامع نظام تعلیم کی دعوت دی، لیکن میں کہوں گا کہ قدیم نظام تعلیم کم از کم قدیم نظام تو ہے، وہ قدامت کو پکڑے ہوئے ہے، اور آپ نے نہ قدامت کو پکڑا ہے نہ جدت کو، اس وقت کا نظام تعلیم تو ایک ایسا شتر مرغ ہے جو نہ قدیم ہے نہ جدید، اگر میرے الفاظ میں کسی قدر شدت یا تلخی آگئی ہو تو مجھے معاف کریں، کہ یہ ایک حقیقت ہے جس کا اظہار ضروری ہے۔

ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو سیاسی اثرات سے آزاد ہو

اس وقت ایک نئے تعلیمی فکر، تعلیمی تخیل اور تعلیمی اجتہاد کی ضرورت ہے جو یورپ کا پابند نہ ہو، جو نہ مشرقی محاذ کا پابند ہو، نہ مغربی محاذ کا، سیاسی اثرات اور مصالح و مفادات سے بالکل آزاد ہو، وہ نہ کسی سیاسی پارٹی کے زیر اثر ہو، نہ کسی حکومت کے دباؤ میں، اس میں کہیں آس پاس بھی اس کا خیال نہ ہو کہ یہ نظام تعلیم فلاں سیاسی پارٹی کے لیے یا نظام حکومت یا فلاں سیاسی ڈھانچے کے لیے مفید ہوگا یا نہیں؟

نظام تعلیم کے لیے قرآن سے ہدایت حاصل کیجیے!

نظام تعلیم اس سب سے بالاتر ہے، نظام تعلیم کی حکمرانی ساری سیاسیات اور معاشیات پر ہونی چاہیے، نظام تعلیم سیاست دیتا ہے، معاشیات دیتا ہے، نظام تعلیم ایک مقدس چیز ہے، اس کو سیاست اور سیاسی مقاصد کا ہرگز پابند نہیں کیا جاسکتا، نظام تعلیم زبانوں کے مسئلہ سے بالاتر، کتابوں کے رد و بدل سے بالاتر ہے، اس کا مسئلہ صرف یہ نہیں کہ ایک کتاب کو ہٹایا اور ایک کو بڑھایا جائے، نظام تعلیم کی توہین ہے اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ مراٹھی اور اردو زبان کا مسئلہ ہے یا یہ کہ فلاں ریاست کا مسئلہ ہے، وہ نبوت کا عطیہ ہے، وحی الہی کا پروردہ ہے، اس کا براہ راست انسان کی روح اور اس کے ضمیر سے تعلق ہو، وہ ان پستیوں پر اترنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا، نظام تعلیم کے لیے قرآن سے ہدایت حاصل کیجیے، انبیائے کرام کے صحیفوں سے رہنمائی حاصل کیجیے، قوموں اور تاریخ انسانی کے وسیع تجربات سے جو قوموں اور ملکوں کے حدود سے بالا تر ہیں، جو مشرق و مغرب کی پابندیوں سے آزاد ہیں، آپ ان سے رہنمائی حاصل کیجیے۔

ناکام نظام تعلیم

نظام تعلیم کے سامنے اچھے انسان پیدا کرنے کے سوا کوئی پاکباز انسان، فرشتہ سیرت انسان، سچے محبت وطن انسان اور صاحب ضمیر و صاحب اصول انسان پیدا کرنے کے سوا کوئی اور مقصد نہ ہونا چاہیے، نظام تعلیم کے لیے اس سے بڑھ کر ازالہ حیثیت عرفی کا جرم نہیں ہو سکتا کہ اس کو ان

حدود و ثغور کے اندر باہنڈ کر دیا جائے، وہ نظام تعلیم کس کام کا اور اس کی کیا قدر و قیمت ہے جو ایک ”کف جو“ کی قیمت کی ترغیب دے، جو چڑھتے سورج کا پجاری بنائے، وہ نظام تعلیم جو اپنے کو دنیا کی منڈی میں نیلام پر چڑھائے، جو زیادہ بولی بولے اس کے ہاتھ اپنے کو بیچنے کے لیے تیار ہو جائے، جس کے لیے کسی مقصد اور عقیدہ کی قید نہ ہو، اس کو ہر اس کام میں استعمال کیا جاسکتا ہو جس میں اس نے ایک دن بھی محنت نہیں کی، اور جو عقیدہ اور ذوق سے مطابقت نہیں رکھتا، بشرطیکہ آپ اس کو قیمت دیتے ہوں، نظام تعلیم کی اس سے بڑھ کر ناکامی نہیں ہو سکتی۔

قدیم دینی مدارس کا کارنامہ

ہمارے قدیم مدارس نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، انھوں نے ایسے آدمی تیار کیے جو اس دنیا کی منڈی میں بکنے کے لیے تیار نہیں تھے، اور آج بھی وہ کہتے ہیں:
 بروایں دام بر مرغ دگر نہ کہ عنقار ابلند راست آشیانہ
 آج بھی ایسی مثالیں موجود ہیں اور اس نظام تعلیم ہی کی نہیں، انسانیت کی آبرو انہی انسانوں کے دم سے قائم ہے۔

انتہائی حساس اور نازک کام

حضرات! آپ مجھے معاف کریں، میری یہ صدائے بے ہنگام آپ کے گوش میں اور آپ کے ذوق پر گراں نہ ہو، میں نے جو کچھ آپ سے کہا، وہ یہ کہ جب آپ تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے بیٹھیں تو تعلیم کے مسئلہ کا تقدس آپ کے سامنے ہونا چاہیے، اس کی پہنائی اور وسعت آپ کے پیش نظر ہونی چاہیے، اس کی بلندی اور رفعت آپ کے سامنے ہونا چاہیے، اس کے مزاج کی نزاکت آپ کے سامنے ہونی چاہیے، یہ کوئی ریاضی کا عمل نہیں جس میں جامد اعداد سے کام لیا جاتا ہو، یہ انجینیرنگ کا عمل نہیں جس میں اصول اور پیمانے استعمال کیے جاتے ہیں، یہ ایک انتہائی حساس اور نازک چیز ہے، اس کا دماغ شاہانہ اور ضمیر درویشانہ ہے۔^(۱)

(۱) ہفت روزہ ”ندائے ملت“، بلکھنؤ (شمارہ ۲، ۱۹ اور ۱۶ جولائی ۱۹۷۲ء)۔

نصاب تعلیم قوم کے فکری ارتقاء

اور

(۱) ذہنی صلاحیت کا آئینہ دار ہوتا ہے

حضرات! میں اپنی دینی، علمی اور تعلیمی برادری کے معزز اور عزیز ارکان کا، اس برادری کے ایک حقیر خادم اور اس برادری کے ایک تاریخی مرکز میں استقبال کرتا ہوں، میں آپ لوگوں کا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اور اس عباسیہ ہال میں، جہاں آپ اس وقت جمع ہیں، خیر مقدم کرتا ہوں، اس عباسیہ ہال میں جس نے دور ماضی کے بڑے اعلیٰ اور بلند پایہ دینی و علمی مناظر دیکھے ہیں اور جس کی شہرہ نشین سے اپنے عہد کے نامی و گرامی، ملکی و غیر ملکی فضلاء، زعماء اور ماہرین تعلیم نے خطاب کیا ہے۔

نصاب تعلیم کا مسئلہ

حضرات! آج کا موضوع نصاب تعلیم ہے، نصاب تعلیم کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر رواروی کے ساتھ کوئی رائے قائم کر لی جائے، یا کسی عجلت اور جذباتیت کے ساتھ فیصلہ صادر کر دیا جائے، یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے، نہ اس کو معصوم قرار دینا صحیح ہے، نہ اس کو کاملاً ناقص اور قابل ترک ثابت کرنا آسان ہے، حقیقت میں نصاب تعلیم کسی قوم کے فکری ارتقاء اس کے

(۱) ”ہندوستان میں عربی مدارس کے نصاب تعلیم“ کے موضوع پر ندوۃ العلماء، (لکھنؤ) میں ۱۹۸۴ء میں منعقد ایک دوروزہ سیمینار میں کی گئی افتتاحی تقریر۔

علمی تجربوں، اس کے طریق فکر اور اس کی ذہنی صلاحیت کی ہانڈی کا سر جوش ہوا کرتا ہے، نصاب تعلیم کسی قوم کے مطالعہ، اس کی فکری سطح اور اس کی ذہنی صلاحیت کا نقطہ عروج (Climax) ہوتا ہے، اس لیے کسی نصاب تعلیم پر اس قوم کے علمی تجربوں، اس ملت کی عملی نمائندگی کرنے والے گروہ کی نفسیات اور اس ملک کے ماحول سے الگ کر کے غور نہیں کیا جاسکتا، نصاب تعلیم اس ماحول کا ایک علمی اظہار ہوتا ہے، نصاب تعلیم کا بھی ایک ضمیر ہوتا ہے، اور اس کی ایک روح ہوتی ہے، جو اس کے پورے جسم میں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے، نصاب تعلیم کچھ بے جوڑ چیزوں کے جمع کر دینے اور پڑھائی جانے والی چند کتابوں کے بے جان مجموعہ کا نام نہیں، نصاب تعلیم کسی ملت یا کسی علمی گروہ کی اپنی ضروریات کے احساس، اپنے زمانہ کے تقاضوں کے سمجھنے اور پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کا ماحصل ہوتا ہے، اس لیے بڑی زیادتی ہوگی کہ کتابوں کی فہرست سامنے رکھ کر ہم رائے قائم کرتے چلے جائیں کہ یہ کتاب اچھی ہے، یہ کتاب اچھی نہیں، یہ کتاب کامیاب، یہ کتاب ناکام، اس فن کا یہ حصہ زیادہ ہے، یہ حصہ کم، یہ نصاب تعلیم کے ساتھ ہی نہیں، علمی حقائق کے ساتھ بھی ناانصافی ہوگی۔

قدیم نظام تعلیم پر ایرانی اثرات

یہ نصاب تعلیم جو ہندوستان میں صدیوں سے رائج تھا، اور جس کی ایک ترمیم شدہ اور ترقی یافتہ شکل درس نظامی کی شکل میں ہے، جو استاذ العلماء ملا نظام الدین (اور مجھے اس کے اظہار میں مسرت اور فخر ہے کہ آج ہم انھیں کے شہر میں بیٹھ کر اور ان کے مرکز علمی سے تھوڑے فاصلے پر یہ گفتگو کر رہے ہیں) کا مرتب کیا ہوا ہے، یہ نصاب درحقیقت ایران کا ساختہ پر داختہ ہے، یہ ایران کے ذہن کا انعکاس ہے، یہ نصاب اصلاً ایران کا عطیہ ہے جو ہندوستان کو ملا، اس لیے کہ جس عہد میں یہ نصاب متعارف ہوا، وہ عہد حکمرانی اور سیاسی طاقت کے لحاظ سے تو ترکی النسل لوگوں کا عہد ہے، لیکن تہذیبی اور فکری اعتبار سے وہ ایرانیوں کا عہد ہے، ہندوستان کی تاریخ کی یہ تقسیم ہے کہ اس کی سیاسی تاریخ ترکوں اور مغلوں کے زیر سایہ پردوان چڑھی، اور علمی و فکری تاریخ ایرانیوں کے زیر سایہ پردوان چڑھی،

اور اس پر حقیقت میں ایرانیوں کا اقتدار قائم رہا ہے، اس ملک میں سیاسی حیثیت سے مغل یا افغانی النسل خاندان حکمرانی کرتے تھے، ان سے پہلے ترک حکمرانی کرتے تھے، لیکن فکری اور ذہنی حیثیت سے یہاں ایرانی حکمرانی کرتے تھے، اور ایران حقیقت میں مشرق کا یونان ہے، ایران اور یونان میں مماثلت کی اتنی باتیں ہیں کہ اگر فلسفہ تارخ کا کوئی طالب علم یہ ثابت کرنا چاہے کہ یونان کا مشرق میں بڑوزا ایران کی شکل میں ہوا، یا ایران کا مغرب میں بڑوزا یونان کی شکل میں ہوا، تو شاید غلطی نہیں ہوگی۔

ہمارے اس قدیم نصاب کا قوام (اور قوام اصل چیز ہوتی ہے) ایران میں تیار ہوا ہے، اور ایران کی کچھ خصوصیات ہیں، جس میں ذہانت، لطافت ذوق، ادبی حاسہ، اور شاعری کا فطری ملکہ اس کی قومی اور نسلی خصوصیت ہے، ان سب کے ساتھ ایک چیز اور ہے، وہ ہے جس کو ہمارے یہاں اردو میں ”رائی کا پر بت بنانا“ کہتے ہیں، اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے ”الفرقان“ کے ”شاہ ولی اللہ نمبر“ میں اس کو ”بات کا بنگلہ بنانے“ کے بلیغ لفظوں میں ادا کیا ہے، یہ ایران کی صدیوں کی نسلی خصوصیت و وراثت ہے، کہ وہ ”رائی کا پر بت“ اور ”بات کا بنگلہ“ بنا دیتا ہے، یہاں پر عرب کی فطرت اور عجم کی فطرت (اور آپ کو یہ معلوم ہے کہ عجم کا لفظ ہمارے قدیم لٹریچر میں جب بولا جاتا ہے تو اس سے مراد ایران ہی ہوا کرتا ہے) ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہے، عرب کی فطرت میں سادگی، ایجاز، واقعیت پسندی اور علمیت ہے، اس بنا پر یہ نہا صحیح ہوگا کہ اسلام کے لیے عرب کی سرزمین اور عرب قوم کے انتخاب کرنے میں یہ حکمت بھی تھی۔

ایجاز لفظی ہی نہیں ہوتا، ایجاز لسانی ہی نہیں ہوتا، ذہنی ایجاز بھی ہوتا ہے، اور ذہنی ایجاز کو لسانی ایجاز پر ترجیح و فوقیت حاصل ہے، بعض قوموں اور افراد کا ذہن ایجاز پسند ہوتا ہے، اور بعض کا طوالت پسند ہوتا ہے، ذرا سی چیز کو جب تک پھیلا کر ان کے سامنے نہ لایا جائے، ان کا ذہن اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہوتا ہے، اس دین کو چونکہ قیامت تک رکھنا تھا، اور مختلف ادوار اور مختلف ملتوں کے لیے اس کو آخری پیغام بنا تھا، اللہ تعالیٰ نے عربوں کا انتخاب کیا، کہ جو بات کے (اس کے حدود اور دائرہ میں رہتے ہوئے) اور اس کے درجہ حرارت و برودت کے مطابق (سمجھنے کے عادی تھے، ذہن اس کو اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، پھر اس

کو بے کم و کاست پہنچانے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا، اس لیے آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کے لیے بھی اور حدیث کی اشاعت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے عربوں ہی کا انتخاب کیا، اور میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جہاں جہاں اسلام عربوں کے ذریعہ سے گیا ہے، وہاں اپنی حقیقی شکل میں گیا ہے، بلا تخریف، بلا غلو و مبالغہ کے گیا ہے۔

حدیث کے ساتھ بے اعتنائی کے اسباب

اس کے ساتھ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان ملکوں میں جہاں عرب اسلام کو لے کر گئے ہیں، وہاں حدیث کی اشاعت ہوئی ہے، اور جہاں غیر عرب عناصر کے ذریعہ سے اسلام گیا ہے، وہاں حدیث بہت بعد میں آئی ہے، اور آپ سراغ لگائیں گے تو کسی عرب ملک سے اس کا ربط ملے گا، عرب فطری طور پر غلو و مبالغہ سے مناسبت نہیں رکھتے تھے، ابن رشتیہ قیروانی کی کتاب ”العمدۃ“ میں آتا ہے کہ کسی نے حضرت سعید بن المسیب سے کہا کہ: ”إن أناساً یکرهون إنشاد الشعر فی المسجد“ انہوں نے کہا کہ ”لقد نسکوا نسکاً عجیباً“ بعض لوگ مسجد میں شعر پڑھنے کو مکروہ سمجھتے ہیں، تو انہوں نے کہا: یہ عجمی زہد ہے، عربی زہد نہیں ہے۔

اس نسک عجمی کا تعلق عبادات ہی سے نہیں، نسک اعجمی کا تعلق علوم سے بھی ہے، حقائق سے بھی، ان کی ترجمانی سے بھی، ان کی مقدار کے تعین سے بھی ہے، کتنی چیز ہو اور کس مقدار میں اس چیز کو لینا چاہیے اور اشیاء کا کیا تناسب ہو؟ اس میں عربی دماغ صحیح تناسب کی طرف چلتا ہے، عجمی دماغ عدم تناسب کی طرف چلتا ہے، قرآن کہتا ہے: ﴿كَانَ أُمْرًا قُرْطًا﴾ [سورۃ الکہف: ۲۸] یعنی وہ افراط یا تفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

دقت پسندی

اس ایرانی ذہن کے خصائص میں سے ایک ”دقت پسندی“ ہے، یعنی وہ کسی بات کو سیدھی سادی شکل میں سمجھنے اور پھر اس سے زیادہ آگے کی منزل یہ کہ اس کا ذوق لینے سے قاصر تھے، جب تک کہ کوئی بات پیچ دار طریقہ سے نہ کہی جائے، اس میں گہرائی نہ ہو، اس

وقت تک ایرانی ذہن اس کی قدر نہیں کرتا، آپ ایران کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو ”مزدک“ کے وقت سے، مجوسیت کے عہد سے لے کر اس عہد تک، آپ سب جگہ یہ ذہن پائیں گے کہ وہ سیدھے سادے اسلام پر قانع نہیں ہے، جب تک اس میں کوئی ”نسک جچی“ یا غلو و مبالغہ، افراط و تفریط شامل نہ ہو، اس کا نقطہ ارتقاء وہ ہے جو اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں: تو خود حدیث مفصل بخواں ازین مجمل

تعدد و تنوع

ایرانی ذہن کا دوسرا خاصہ ہے: احتمال آفرینی، ہر چیز میں تعدد و تنوع، یعنی ایک چیز پر وہ کفایت نہیں کرتا، فرض کیجیے کہ یہ بات ہے کہ مصنف نے کتاب کی ابتدا کرتے ہوئے حمد و صلوة کیوں چھوڑ دیا؟ مصنف نے کتاب میں خطبہ مسنونہ کیوں نہیں لکھا؟ عرب اس کی ایک تاویل پر اکتفا کرے گا، لیکن ایرانی ذہن اس میں ایسی موشگافی سے کام لے گا اور ایسی دور کی کوڑی لائے گا کہ مصنف بھی سنے تو حیران رہ جائے اور بول اٹھے

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

ایک لطیفہ

یہ ذہن علمی حلقہ سے نکل کر قومی حلقہ میں آجاتا ہے اور وہ لوگ بھی جو تعلیم و تعلم کا کام نہیں کرتے، اسی طرح سوچنے لگتے ہیں، میں ایک لطیفہ سناتا ہوں جس سے شاید کانوں کا ذائقہ بھی بدل جائے، کوئی عباسی خلیفہ یا وزیرائے سلطنت میں سے کوئی اہم شخص اپنی مملکت کے کسی حصہ میں گئے تو ان کے اعزاز میں وہاں توپ نہیں چلی، انھوں نے وہاں کے گورنر کو بلایا اور کہا کہ ہمارے اعزاز میں توپ کیوں نہیں چلی؟ یہ تو توہین ہوئی!!، انھوں نے کہا: اس کے دس وجوہ ہیں، انھوں نے بھی شاید کوئی کتاب نحو یا منطق کی پڑھی ہوگی، انھوں نے کہا: کیا؟ بتاؤ۔ انھوں نے کہا: سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ بارود نہیں تھی، انھوں نے کہا: بس اب زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، جب بارود نہیں تھی تو اس کے بعد اب کہنے کی کیا ضرورت ہے، بارود نہ ہو تو توپ کیسے چل سکتی

ہے؟ لیکن وہ صاحب تیار تھے کہ اس کے بعد بھی وجہ بیان کریں، وہ عملی آدمی تھا، اس نے غالباً منطق نہیں پڑھی تھی، اس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، کہ اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، نہ میرے پاس فاضل وقت ہے، نہ تمہارے پاس، آپ کسی عربی النسل، عربی الذوق مصنف کی کتاب میں بلاوجہ اسباب و علل کی اتنی بہتات نہیں پائیں گے، یہ ایرانی ذہن ہے۔

فقہ و قانون

میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کسی نصاب کے متعلق کوئی رائے اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ اس پر زمان و مکان کے کیا اثرات پڑے ہیں؟ اس لیے کہ نصاب تعلیم کو نہ زمان سے علاحدہ کیا جاسکتا ہے نہ مکان سے، آپ سب کو معلوم ہے کہ پہلے ہندوستان میں وہ محور جس کے گرد سارا نصاب گردش کرتا تھا، وہ فقہ کا علم تھا، اس لیے کہ یہاں حکومت کرنی تھی، یہاں کا آئین اسلامی تھا، شریعت محمدی پر عمل ہوتا تھا، اس لیے عملی ضرورت یہ تھی کہ فقہ پڑھی اور عمیق نظر ہو، تو سب سے پہلے ہندوستان میں جب نصاب درس جاری ہوا، اس وقت فقہ کی اس پر حکمرانی تھی، فقہ کا حصہ اور اس کی چھاپ سب سے زیادہ گہری تھی، اس کے بعد اصول فقہ کا نمبر آیا، جب اصول فقہ نے ایران میں اور ایران سے باہر خاص حالات و اسباب کی بنا پر ترقی کی، اور اس پر موشگافیاں ہوئیں، اور وہ ایک بہت بڑا عالم بن گیا، تو اصول فقہ کا حصہ بڑھا، پھر جب علامہ وجیہ الدین گجراتی، (۱) مولانا عبداللہ (۲) اور مولانا عزیز اللہ (ملاتی) ایران گئے اور وہاں کے بلند پایہ اساتذہ سے جن کو علوم حکمت میں تو غل تھا، پڑھ کر آئے، اس کے بعد امیر فتح اللہ شیرازی اور حکیم علی گیلانی ایران سے آئے، تو جیسا کہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے (آپ حضرات کی خدمت میں میرے والد ماجد کا رسالہ ”ہندوستان میں قدیم نصاب درس“ جو ہزاروں صفحات کے حوالہ کا نچوڑ ہے، پیش کیا جائے گا، اور میں آپ حضرات سے یہ گزارش کروں گا کہ آپ اس پر ضرور ایک نظر ڈالیں،

(۱) مولانا وجیہ الدین گجراتی نے ایران جا کر علامہ عماد الدین محمد بن محمود الطاری سے تعلیم حاصل کی۔ (ح)

(۲) وہ ایران کے مشہور فاضل علامہ عبداللہ یزدی کے شاگرد تھے۔ (ح)

انہوں نے ہندوستان میں ہر عہد کا نصاب مرتب شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے) کہ جب یہ ایرانی عنصر آیا، تو ہندوستان پر اس کا گہرا اثر پڑا، اس تعلق کی تجدید بھی برابر ہوتی رہی، ہمارا موجودہ نصاب درس جس کو ملا نظام الدین کے ذریعہ توانائی اور زندگی ملی، وہ درحقیقت امیر فتح اللہ شیرازی کا پروردہ یا ساختہ پر داختہ ہے، وہ ایرانی ذہن کا عکاس تھا، فکری طور پر بھی، ادبی طور پر بھی، (اس کے شواہد آپ شعر الجم میں دیکھیں گے) ہندوستان کا ذہن اسی نصاب کو قبول کرنے کے لیے جو درس نظامی کی شکل میں ہم کو ملا، پورے طور پر تیار ہو چکا تھا۔

درس نظامی کی خصوصیات

میں یہ بھی عرض کر دوں کہ درس نظامی اس زمانے کے علماء کی ذہنی پرواز کا بہترین نمونہ ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ کم سے کم اس عہد میں، یعنی دسویں یا گیارہویں صدی ہجری تک دنیا کے کسی ایسے ملک کا ہم کو علم نہیں جہاں علم کے اندر اتنی گہرائی آگئی ہو، اتنی وسعت و تنوع پیدا ہو گیا ہو، اور اس کے اندر گل کاریاں پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہو، ہم یہ بڑی حق تلفی اور ایک غیر علمی انداز فکر سمجھتے ہیں کہ درس نظامی کو آنکھ بند کر کے یہ کہہ دیں کہ یہ سراپا ناقص ہے، اس میں پھر ہندوستانی مصنف کی دوا ہم کتابوں کا اضافہ ہوا: (۱) سلم العلوم (۲) مسلم الثبوت، جو دونوں محبت اللہ بہاری کی تصنیف ہیں، ہندوستان کے علمی حلقہ نے اس کو سینے سے نہیں، آنکھوں سے لگایا، اور تنہا مسلم کی بارہ شرحیں لکھی گئیں، اور جامع ازہر کو بھی مجبور ہونا پڑا کہ مسلم الثبوت کو اپنے نصاب میں داخل کرے، اور مسلم کا حال تو یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ حمد اللہ اور ملا مین اور پھر اس کے بعد کی شرحیں ساری کی ساری اس کی شرحیں ہیں، یعنی گویا مسلم ایک معیار فضیلت کے طور پر اور انسان کی ذہانت کے ایک پیمانہ کے طور پر ایک کتاب آئی، اور پورے علمی حلقہ نے اس کے ساتھ اپنی گرویدگی کا بلکہ شیفتگی کا ثبوت دیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت تعلیم کا صرف ایک ہی نظام تھا، یہ تعلیم کی شہیت (دوئی) نہیں تھی، ہندوستان میں دو متوازی نظام نہیں چل رہے تھے، تنہا یہی نظام تھا جو قاضی و مفتی بھی پیدا کرتا تھا، مفسر و محدث بھی پیدا کرتا تھا، اور سول آفیسرز (Civil Officers) بھی

پیدا کرتا تھا، یعنی کوئی آدمی جو وزارت عظمیٰ کے عہدہ تک پہنچے یا عدالت کے عہدہ پر پہنچے، یا انتظامیہ کے کسی بڑے سے بڑے عہدہ پر پہنچے، اس کا کچھ پڑھا لکھا ہونا ضروری تھا، اور پڑھے لکھے ہونے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ وہ جہاں تک پڑھ سکے، جہاں تک اس کے حالات اجازت دیں یا اس کی ہمت ساتھ دے، وہاں تک درس نظامی میں پڑھے، آپ جس کے حالات پر دیکھیں گے، تعلیم یافتہ لوگوں میں جس کا شمار تھا، معلوم ہوگا کہ کسی نہ کسی درجہ تک متوسطات تک یا ابتدائی کتابوں تک اس نے یہ کتابیں ضرور پڑھی ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس علمی گروہ میں ایک خاص ذہن پیدا ہوا، پھر ان کے اندر جو گویا پورے تعلیم یافتہ اور فاضل نہیں تھے، ان کے اندر بھی کسی نہ کسی درجہ میں یہ ذہن منتقل ہوا، پھر ان کے بعد ان کے ماحول پر اثر انداز ہوا، اس کے بعد ماحول سے نکل کر پڑھی لکھی مسلمان آبادی پر اس کا اثر پڑا، اس کا اثر آپ دیکھنا چاہیں تو اُس زمانے کے علماء کے اختلاف کے میدانوں میں دیکھیں، اظہار خیال کے طریقوں میں دیکھیں، اُن کی تصنیفات میں دیکھیں، پھر یہ بات معاشرے میں آئی، اس لیے کہ نصاب تعلیم پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے، جو نصاب تعلیم ماحول و معاشرہ پر اثر انداز نہ ہو، وہ ناکام نصاب تعلیم ہے، اور اگر اثر انداز ہو تو خطرناک بات ہے، اس لیے ہمیں دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھ کر دیکھنا چاہیے، یہ فرض کر لینا صحیح نہیں کہ نصاب تعلیم سے وہی افراد متاثر ہوتے ہیں جو مدرسہ سے تعلق رکھتے ہیں، فاضل و عالم اگر مدرسہ سے نکل کر اپنے ماحول پر اثر انداز نہیں ہوتے اور ان کا احترام نہیں ہوتا، تو وہ مدرسہ ناکام ہے، وہ نصاب تعلیم ناکام ہے۔

قدیم نصاب تعلیم کی نفسیات

اگر ان کا اثر ہوتا ہے تو دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا اثر ہے؟ کہیں غلط اثر تو نہیں پڑ رہا ہے؟ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان اثرات کو دیکھنے کے لیے آپ کو اس زمانے کی تصنیفات دیکھنی چاہیے، ایک دوسرے کی تردید میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کو دیکھنا چاہیے، مخالفت و تردید میں آخری حد تک پہنچ جانا، اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ دلائل کے ساتھ منوانا اور اس پر اصرار کرنا

اور اس میں احتمالات نکالنا، اس نصاب نے یہ ذہن پیدا کیا، اپنی ان تمام خوبیوں اور کمالات کے ساتھ، لیکن ”إِذَا نَبَتَ النَّسِيءُ نَبَتَ بِلَوَازِمِهِ“ یہ نصاب جب آیا تو اپنے پورے نفسیات کے ساتھ آیا، میں عرض کرتا ہوں کہ نصاب تعلیم کی بھی نفسیات (Psychology) ہوتی ہے، اور جس نصاب تعلیم کی نفسیات نہ ہو، وہ پانی کی سطح پر ہے، اندر نہیں اترتا۔

نصاب تعلیم کا زندگی اور معاشرے سے مستحکم ربط ہے

اگر ایک عمل حقیقت کے طور پر سوچا جائے تو بات بہت سیدھی اور صاف ہے کہ نصاب تعلیم کا زندگی سے، معاشرے سے اور طرز فکر سے، اور یہاں تک کہ دینی تصورات سے، اور ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرنے سے، اور یہاں تک عرض کرتا ہوں کہ قرآن وحدیث کے فہم سے مستحکم ربط ہے، آپ اس سے اس کو جدا نہیں کر سکتے، آپ اب یہ دیکھیے کہ قرآن وحدیث کا فہم ہے، آپ قدیم عہد کی تفسیریں دیکھیے اور پھر متاخر عہد کی تفسیریں دیکھیے، خاص طور پر جو بلا دعجم میں لکھی گئیں، تو آپ کو کھلا ہوا فرق معلوم ہوگا، ان میں سادگی ہے، عملیت ہے، حقیقت پسندی ہے، قرآن مجید کے مقاصد سے قرب، نبوت محمدی جو عرب میں آئی، اس سے مناسبت ہے، اور دوسری تفسیروں میں آپ دیکھیے گا تو وہ بات نہیں پائیے گا، بات صرف اتنی ہے کہ نصاب تعلیم انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے، خاص حالات میں بنتا ہے، خاص مقاصد اور مٹح نظر اور ضروریات کے پیش نظر بنتا ہے اور اس میں ایک عہد تک چلنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اگر ہم اس کو یوں کہہ لیں کہ وہ ”جسم حی ونامی“ ہے، جس کی حیات اور نمو ایک خاص عہد تک جاتی ہے، تو پھر اس کے بعد بات مختصر اور آسان ہو جاتی ہے، اگر ہم اس کو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معصوم چیز ہے، یا آسمان سے نازل ہوا ہے، یا ایسے مقدس ہاتھوں کا مرتب کیا ہوا ہے کہ جس کے بعد اب اس پر غور کرنا ایک طرح کی بے ادبی ہے، تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی علمی نقطہ نظر اور معروضی طریقہ پر ہو

اس موقر مجلس اور آپ جیسے حضرات کو جو پورے علمی ہندوستان کی نمائندگی کر رہے

ہیں، اس لیے تکلیف دی گئی ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ، حقیقت پسندی کے ساتھ، اور پورے انصاف و توازن کے ساتھ غور کریں کہ جو چیز ان میں سے اب قابل تبدیلی ہو گئی ہیں، ان کو تبدیل کریں، لیکن وہ تبدیلی جو ہو، وہ بے سوچے سمجھے نہ ہو، وہ کسی جذبہ کے ماتحت یا کسی رد عمل کے نتیجہ میں نہ ہو، بالکل علمی نقطہ نظر سے اور معروضی طریقہ پر ہو۔

نصاب تعلیم میں تبدیلیاں عہد بہ عہد ہوتی رہیں

دارالعلوم دیوبند نے اپنے صد سالہ اجلاس میں مجھے یہ اعزاز بخشا کہ نصاب تعلیم پر جو سیمینار تھا، مجھے اس کی صدارت تفویض کی گئی، میں نے کہا کہ حضرات! میں آپ سے اول تو یہ بات کہتا ہوں کہ نصاب تعلیم کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے اسلاف ہم سے کہیں زیادہ حقیقت پسند اور ہم سے کہیں زیادہ وسیع النظر اور کہیں زیادہ فراخ دل تھے، اس لیے کہ ہمیں نصاب تعلیم کی پوری تاریخ میں نظر آیا کہ برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں، اور معیار فضیلت بھی بدلتا رہا، پہلے فقہ، پھر اصول فقہ، پھر اصول حکمت، اور حدیث بہت بعد میں آئی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کوششوں سے اس کا سکہ چلا، دوسری بات یہ ہے کہ یہ تضاد ہے تاریخ کا، جس کو آپ حضرات کے سامنے رکھا جاسکتا ہے، کہ جب ہندوستان میں ایک ہی حکومت تھی، یعنی صرف مسلمان حکومت کر رہے تھے، صرف خاندان بدلتے تھے، خاندان غلاماں آیا، پھر تغلق آئے، لودھی آئے، پھر سوری آئے، اور پھر مغل آئے، تو جب تسلسل تھا اسلامی حکمرانی (Sovereignty) میں اقتدار اعلیٰ مسلمان کا تھا، اقتدار اعلیٰ ایک تھا، اس کا دین ہی نہیں بلکہ مذہب فقہی بھی ایک تھا یعنی حنفی، آئین بھی ایک تھا یعنی شرع محمدی، اس کی زبان ایک تھی یعنی فارسی، اور مذہبی زبان عربی تھی، اور تہذیب بھی ایک ہی تھی یعنی ایرانی، عربی، ہندوستانی تہذیب کا آمیزہ، سب میں وحدت تھی اور تسلسل تھا، اس وقت تو نصاب تعلیم سو سو برس میں بدلتا رہا، اور جب زمین و آسمان بدل گئے، اور نہ وہ حکمرانی رہی، (Sovereignty) رہی، اور نہ وہ تہذیب رہی، اور نہ وہ آئین رہا، اور مذہب بھی تزلزل میں پڑ گیا، اس وقت سے اس

پر ایسی مہر لگی، ایسی مہر لگی کہ کوئی اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، کیا اس کی بنا پر ایک مؤرخ یہ بے لاگ فیصلہ نہیں دے سکتا کہ ہمارے اسلاف ہم سے زیادہ وسیع النظر تھے، اور ہم سے زیادہ حقیقت پسند، اور زمانہ شناس تھے؟ ان کا ہاتھ اور ان کی انگلیاں زمانہ کی اور ملت کی نبض پر رہتی تھیں، اور ہماری انگلیاں نبض سے ہٹ گئی ہیں، اور ہمیں معلوم نہیں کہ نبض کس طرح چلتی ہے؟

طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم میں خوب سے خوب تر کی تلاش طلبہ کا واجب حق ہے

دوسری بات میں نے یہ کہی، اور ذرا کسی حد تک اپنے حدود سے تجاوز ہو کر میں نے کہا، کہ میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ اگر کسی مدرسہ میں اتفاقاً کسی دن رات کی باسی دال طلبہ کو کھانے کو دے دی جائے، تو اس کا کیا اثر ہوگا؟ کیا طلبہ شکایت نہیں کریں گے؟ حالانکہ کسی مدرسہ نے یہ اعلان نہیں کیا کہ ہم تازہ سے تازہ اور عمدہ سے عمدہ کھانا دیں گے، اس کی تو صرف یہ ذمہ داری ہے کہ بہتر سے بہتر تعلیم مہیا کرے، لیکن اس کے بعد بھی لوگ اس پر سخت احتجاج کریں گے کہ رات کی باسی دال دے دی گئی ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اگر ہم واقعی اس بات پر مطمئن ہوں کہ مثلاً ادبیات اور عربی زبان کی تعلیم میں فلاں کتاب زیادہ مفید ہو سکتی ہے اور مقاصد کو اس زمانہ کے بدلے ہوئے حالات میں، جبکہ عرب دنیا سے ہندوستان کے ایسے رابطے پیدا ہو گئے ہیں کہ جو ہندوستان کی پوری ہزار سالہ تاریخ میں کبھی نہیں تھے، پھر دعوت کا ایک میدان نکل آیا، وہاں کے اسلامی قائدین اور یہاں کے بہت سے مخلصین اور علمائے ربانین کی کوششوں سے، تو اب عربی زبان سکھانے کے لیے یہ طریقہ زیادہ مفید ہوگا اور یہ نصاب زیادہ مفید ہوگا، تو اب بتائیے کہ اس کو کوئی مدرسہ اس لیے نہیں اختیار کرتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے فلاں کتاب پڑھی تھی، تو بتائیے کہ کیا یہ دیانت کے مطابق ہوگا؟ یہ طلبہ کے ساتھ انصاف ہوگا؟ یہ زمانہ کے انصاف ہوگا؟ یہ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس باسی دال سے کہیں زیادہ ایک طرح کی کوتاہی ہے اور حق تلفی ہے، کہ اگر لڑکے باسی دال کھائیں گے، تو ان کے جو اصل مقاصد ہیں، جو مقصد ان کو مدرسہ کی طرف کھینچ کر لایا

ہے، اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، لیکن مسلسل ان کو بہترین طریقہ تعلیم سے محروم رکھنا اور اس پر اصرار کرنا یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

نصاب تعلیم کو ملت کے اساسی مقاصد کا تابع اور خادم ہونا چاہیے

میں ان الفاظ کے ساتھ اس موثر مجلس کا افتتاح کرتا ہوں اور آپ حضرات کو دعوت فکر دیتا ہوں کہ آپ نصاب پر بالکل غیر جانبدارانہ طریقہ سے اس کے مختلف موضوعات پر غور فرمائیں، اور آپ کے سامنے صرف اپنے ان عزیز نوجوانوں کا مستقبل ہو اور اس عہد کے تقاضے ہوں، اور وہ اساس و مقاصد ہوں جن کا تابع اور خادم نصاب تعلیم ہے، اگر یہ نصاب تعلیم اس ملت کے اساسی مقاصد کے تابع اور خادم نہیں ہے تو اسلامی نصاب تعلیم نہیں ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی تقدس نہیں ہے، (تقدس تو یوں بھی نہیں) وہ قابل احترام بھی نہیں، بس یہ دو چیزیں نوجوانوں کا مستقبل اور عہد کے تقاضے، اس سے بڑھ کر ملت کے اساسی اور کلی اور اصولی مقاصد، جن کا نصاب تعلیم کو ایک ادنیٰ خادم ہونا چاہیے، اور نصاب تعلیم کی اہمیت اور قیمت ساری یہ ہے کہ ان مقاصد کی تکمیل میں وہ علمی انداز میں علمی میدانوں میں مدد کرتا ہے، بس یہ حقیقت میں نصاب تعلیم کی معنویت اور قیمت ہے، نصاب تعلیم ملت اور عہد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، آثار قدیمہ کی کوئی چیز نہیں ہے کہ آپ میوزیم میں اسے رکھیں اور دکھائیں کہ کسی زمانہ میں ایسا ہوتا تھا، نصاب تعلیم کو ملت کے ساتھ، زمانہ کے ساتھ اور تقاضوں کے ساتھ مربوط رہنا چاہیے، اور یہ ہمارے لیے قرآنی نظریہ سے بھی، دعوتی نظریہ سے بھی اور علمی نظریہ سے بھی ضروری ہے۔

آخر میں آپ حضرات سے معافی چاہتا ہوں، اگر کوئی لفظ ایسا نکل گیا ہو جس سے کسی درجہ میں کسی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو مجھے معاف فرمائیں۔^(۱)

(۱) پندرہ روزہ ”تعمیر حیات“، لکھنؤ (شمارہ ۲۵، مارچ، ۱۰، ۱۱، ۲۵، اپریل ۱۹۸۲ء)۔

ہندوستان میں مسلم بچوں کا تعلیمی مسئلہ^(۱)

شیراز ہند جو نیپور کی علمی تاریخ

اضلاع مشرقی کا یہ اہم تعلیمی اجتماع جس شہر میں منعقد ہو رہا ہے، اس کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں صدیوں دینی و علمی مرکزیت حاصل رہی ہے، نوں صدی کے بالکل آغاز میں امیر تیمور گورگاں کے حملہ نے جب دہلی کو زیر کر لیا، تو جو نیپور کا پایہ دہلی سے بلند ہو گیا، اور بہت سے علمی جواہرات جو سلطنت دہلی کے لیے کوہ نور اور سرمایہ فخر و سرور تھے، جون پور کی طرف منتقل ہو گئے، انھیں منتقل ہونے والوں میں ملک العلماء شیخ شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۸۲۹ھ) اور ابوالفتح بن الشیخ عبدالحی بن عبدالمقندر الکندی (م ۸۵۸ھ) بھی تھے، جن میں سے ہر ایک اپنی ذات سے ایک عظیم الشان دارالعلوم تھا، اور ہر ایک نے فضلاء کا ملین فن اور اہل درس کی اتنی بڑی جماعت تیار کر دی جو اس وقت بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے ممکن نہیں۔

سلطان وقت علم کے بور یہ نشین پر قربان ہوتا ہے

یہی وہ سرزمین ہے جہاں تاریخ کی چشم عبرت نے تخت سلطنت کو مسند علم کے سامنے جھکتے ہوئے اور سلطان وقت کو علم کے بور یہ نشین پر قربان ہوتے ہوئے دیکھا، دنیا کی علمی تاریخ میں یہ واقعہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ جب ملک العلماء شیخ شہاب الدین دولت آبادی بیمار ہوئے اور ان کی صحت سے ناامیدی ہوئی تو سلطان ابراہیم شرقی نے پانی کا پیالہ ان کے سر پر گھما کر خدا سے عرض کیا کہ ملک العلماء سے میری سلطنت کی رونق اور آب و تاب ہے، اور ان کی ذات خلق خدا

(۱) ۱۳۷۴ھ میں جون پور میں منعقد دینی تعلیمی کانفرنس کا خطبہ صدارت۔

کے لیے سرچشمہ رفیض ہے، تو ان کی جگہ مجھے قبول فرما، اور ان کو اٹھا کر میری سلطنت کو بے چراغ اور کم قیمت نہ کر، یہ دعا قبول ہوئی، ملک العلماء نے ابراہیم شرقی کی وفات (۸۴۴ھ) کے پانچ سال بعد (۸۴۹ھ) تک دنیا کو اپنے علم و درس اور تصنیف و تالیف سے فیض پہنچایا۔

جونپور میں علم اور علماء

سلاطین شرقیہ کے ہشتاد (۸۰) سالہ دور حکومت (۸۰۲-۸۸۱ھ) میں دہلی اور جونپور کے درمیان سیاسی زور آزمائی بھی جاری رہی، اور علمی تقابل و مسابقت بھی، پہلی کوشش کے نتیجے میں جونپور نے کوئی پائیدار کامیابی حاصل نہیں کی، لیکن دوسرے مقابلہ میں جونپور بارہا دہلی سے بازی لے گیا، اور علمائے دہلی نے علمائے جونپور کی عظمت اور علمی تفوق کو تسلیم کیا، سلطنت شرقیہ کے زوال کے بعد بھی علمائے جونپور کا دور دورہ اور ان کا علمی دبدبہ قائم رہا، دسویں صدی میں مولانا الہ داد جونپوری (م ۹۲۳ھ) اور مولانا بہاء الدین (م ۹۱۱ھ) جیسے علمائے کاملین، اور گیارہویں صدی میں دیوان محمد رشید (م ۱۰۸۳ھ) جیسا فاضل یگانہ و مرشد زمانہ، ملا محمود جونپوری (م ۱۰۸۲ھ) جیسا مجتہد فن اور یکتائے روزگار عالم نظر آتا ہے، جس کی ”شمس بازنہ“ درس نظامی کے نظام شمس میں بلند ترین مقام رکھتی ہے، بارہویں صدی میں جس طرح دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ذات میں بیک وقت مدرسہ و خانقاہ اور ہاتھ میں جام شریعت و سندان عشق نظر آتے ہیں، اسی طرح اس صدی کی ابتدا میں جونپور میں دیوان محمد رشید کے خلف رشید بلکہ ارشد دیوان محمد ارشد (۱۱۱۳ھ) صاحب درس و صاحب ارشاد ہیں۔

تیرہویں صدی میں جونپور کو اس صدی کے مجدد حضرت سید احمد شہیدؒ کے دو جلیل القدر خلفاء حضرت مولانا سخاوت علیؒ اور حضرت مولانا کرامت علیؒ کے وجود پر ناز ہے، اول الذکر نے جونپور اور باندہ میں برسوں درس و تدریس میں مشغول رہ کر صد ہا جلیل القدر عالم اور مدرس پیدا کیے، اور اضلاع مشرقیہ میں عقائد و اعمال کی اصلاح کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، آخر الذکر سے بنگال کے وسیع اور پسماندہ خطہ نے دین کی روشنی اور علم کی چاشنی پائی، اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور آخر میں کسی ایک شخص نے اتنے وسیع خطہ اور اتنی کثیر

تعداد کو اپنی تبلیغی مساعی سے متاثر نہیں کیا، پھر جب مدارس کا دور آیا، تو شیخ امام بخش کے مدرسہ حنفیہ نے نصف صدی تک علم کی شمع روشن رکھی، اور ہندوستان کے متعدد جلیل القدر علماء و مدرسین نے اس کو اپنے درس و تدریس سے رونق بخشی، اس لیے جون پور اس وقت سے جب فیروز شاہ کے عہد میں وہ آباد ہوا تھا، اس وقت تک علم کی امانت اپنے سینے سے لگائے رہا، اس گذشتہ تاریخ اور ان شاندار روایات کی بنا پر اس کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ یہ اہم تعلیمی اجتماع اس کی سر زمین پر منعقد ہو۔

حضرات! زمانہ کے انقلابات نے دہلی اور جون پور کی سیاسی رقابت صدیوں پہلے ختم کر دی تھی، اور جون پور نے دسویں صدی ہی میں دہلی کی سیادت و مرکزیت تسلیم کر لی تھی، علم کی ترقی و اشاعت میں اس وقت سے وہ دہلی کے دوش بدوش اور قدم بقدم ہے، موجودہ تعلیمی اجتماع جس میں مشرقی اضلاع کے اہل علم و اہل فکر جمع ہیں، اور جونپور کو میزبانی کو شرف حاصل ہو رہا ہے، اس بات کا تازہ ثبوت ہے کہ وہ اس اہم تعلیمی مسئلہ میں دہلی کے ساتھ اشتراک عمل اور تعاون کے لیے تیار ہے اور اس کو دہلی کی اولیت و مرکزیت تسلیم ہے۔

قدیم اور جدید طرز حکومت کا موازنہ

حضرات! پہلے حکومت ایک محدود ادارہ تھا، جس کا تعلق زیادہ تر ملک کے نظم و نسق، فوج پولس اور محاصل و مالیات سے ہوتا تھا، زندگی کے بہت سے شعبے اس کے دائرہ عمل اور دائرہ اثر سے خارج ہوتے تھے، قوم اپنے نظام تعلیم، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت میں آزاد ہوتی تھی، اور اس بارے میں خود مختار تھی کہ وہ ان کا جو سانچہ پسند کرے اختیار کرے یا گذشتہ سانچہ قائم رکھے، اس کا نتیجہ تھا کہ انقلاب سلطنت سے ضروری نہ تھا کہ تعلیم و تہذیب میں کوئی انقلاب آئے، تا تا ریوں کے حملہ کی قیامت خیزی ابھی تک دنیا کو یاد ہے، اس نے تمام عالم اسلام کی چولیس ہلا دیں، لیکن عالم اسلام کے نظام تعلیم و تہذیب کو نہیں چھوڑا، ہندوستان کے فاتحین اور حکمران خاندانوں نے یہاں کے نظام تعلیم اور اس کے مختلف عناصر اور قوموں کی تہذیبی و تعلیمی خود مختاری میں بہت کم دخل دیا، یہ طرز حکومت کچھ خوبیاں بھی رکھتا تھا اور کچھ

معائب بھی، اس وقت اس کی خوبیوں اور نقائص کا موازنہ مقصود نہیں، لیکن جب سے یورپ میں نئی طرز کی جمہوری حکومت کا آغاز ہوا، یہ سمجھا جانے لگا کہ حکومت محض ایک انتظامی مشین نہیں، بلکہ اس کی حیثیت ایک اتالیق اور مربی منتظم کی ہے، اس کا دائرہ عمل ملک و قوم کی پوری زندگی پر وسیع، اور اس کے حدود و اختیارات زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں، وہ قوم کو تعلیم دینے، تہذیب سکھانے اور اس کی دماغی تربیت کی بھی ذمہ دار ہے، اس طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ حکومتیں پورے پورے ملک اور پوری پوری قوم کی تعلیم کا بندوبست کرتی ہیں، اس کے لیے وسائل تعلیم مہیا کرتی ہیں، لاکھوں کی تعداد میں مدارس و مکاتب قائم کرتی ہیں، اور تعلیم کو عام کرنے کی لیے جبری تعلیم کے قانون کا نفاذ کرتی ہیں۔

حکومت درحقیقت ایک اتالیق اور سرپرست کی حیثیت رکھتی ہے

حکومت کا یہ جدید رجحان - جس کی تاریخ ایک صدی سے زیادہ نہیں ہے - ایک بڑا ترقی پسندانہ مبارک رجحان ہے، واقعہ یہ ہے کہ حکومت کو انتظامی، فوجی و مالیاتی دائرے میں محدود کر دینا حکومت کا ایک جماداتی تخیل اور فرض انص حکومت کا نہایت تنگ اور محدود تصور ہے، ایک صحیح اور فرض شناس حکومت درحقیقت ایک اتالیق (Guardian) اور ایک خیر خواہ و شفیق سرپرست (Patron) ہی کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے ان تمام فرض انص و خدمات کی انجام دہی کی توقع بجائے جو ایک شفیق سرپرست اور ایک مستعد فرض شناس مربی انجام دیتا ہے۔ حکومت کی ایک اہم ترین ذمہ داری ہے کہ اپنے شہریوں کی تعلیم کا انتظام کرے اور ان کو خواندہ و تعلیم یافتہ بنانے کی امرکانی جدوجہد کرے، تعلیم کے وسائل و مراکز مہیا کرے اور کوشش کرے کہ ملک میں ایک بھی ناخواندہ اور اور بے شعور انسان نہ رہے، جہاں تک حکومت کے اس بنیادی تخیل کا تعلق ہے، کسی صاحب شعور انسان کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ صحیح دینی حکومت جس کا نمونہ خلافت راشدہ تھی، اسی بنیادی عقیدہ پر قائم ہوئی کہ حکومت پوری قوم کی اتالیق ہوتی ہے، فرق اتنا ہے کہ خلافت نے اپنے کام کو حرف شناسی اور خواندگی میں محدود نہیں سمجھا تھا اور اس نے کبھی قناعت نہیں کی کہ ساری قوم خواندہ ہو جائے

بلکہ قوم کے اخلاقی شعور اور اخلاقی بلوغ کو اپنا منہ بنائے نظر بنایا، اس طرز حکومت کے ایک معتبر نمائندے حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے اپنے مشہور تاریخی فقرے میں اس طرز حکومت کی اسی امتیازی خصوصیت کو بیان کیا، جب خالص انتظامی ذہنیت رکھنے والے بعض کارکنان حکومت نے ان کی اصلاحی تجاویز اور جمہور کے دینی رجحان کی وجہ سے حکومت کے مالی خسارے کی شکایات کیں تو انھوں نے اپنے طرز حکومت کی طرف سے یہ کہہ کر مدافعت کی اور اس کو حق بجانب ثابت کیا: ”جن کے ہم قائم مقام ہیں [یعنی محمد رسول اللہ ﷺ] وہ تحصیلدار بنا کر دنیا میں نہیں آئے تھے، مصلح اور ہادی بن کر دنیا میں آئے تھے۔“

زیرِ قدم تہزار جان است

حکومت کا یہ بنیادی نخیل کہ قوم کی عمومی تعلیم اس کا فرض منصبی ہے، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، نہایت قابل قدر اور لائق تحسین اقدام ہے، اس میں کسی شخص کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن یہ اقدام جتنا مبارک اور عظیم الشان ہے اس کا راستہ اتنا ہی نازک اور مشکل ہے، اور اس پر چلنے کے لیے بڑی سبک روی اور احتیاط کی ضرورت ہے کہ رع

زیرِ قدم تہزار جان است

جبری تعلیم: اندیشے اور نقصانات

ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف عقائد، مختلف اخلاقی قدروں اور مختلف مذاہب کی قومیں آباد ہوں، تعلیم کا جبری اور عمومی نظام نافذ کرنے کے لیے بڑی وسعت نظر، وسعت قلب اور شدید احتیاط کی ضرورت ہے، ذرا سی بے احتیاطی کم نظری، یا عجلت کی کار فرمائی سے اس کا اندیشہ ہے کہ جن قوموں کو اپنے عقائد جان سے زیادہ عزیز ہیں، ان کی زندگی میں ایک ایسی تلخی اور کوفت اور ایک ایسی ذہنی کشمکش پیدا ہو جائے جو اس ملک کی اخلاقی زندگی کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں، وہ یا تو ایسے نظام تعلیم کا مقاطعہ اپنا دینی فرض سمجھیں یا نہایت بددلی اور ذہنی کشمکش کے ساتھ اس کو قبول کریں، ایک نظام تعلیم کی یہ بہت بڑی ناکامی اور اس کے

مرتب کرنے والوں کی بڑی غیر دانشمندی ہے کہ آبادی کی ایک بڑی تعداد اس کا گرجموشی اور مسرت کے ساتھ استقبال نہ کرے۔

دانشمندانہ طرز عمل

ایسے مختلف المذاہب اور مختلف العقائد ملک کے لیے سب سے زیادہ دانش مندانہ طرز عمل یہ ہے کہ اس ملک میں عمومی و جبری نظام تعلیم کو پوری شدت اور خلوص و دیانتداری کے ساتھ غیر جانبدارانہ اور نامذہبی رکھا جائے، اور اس کو آبادی کے کسی عنصر اور کسی فرقہ کے (خواہ وہ تعداد میں کتنا ہی غالب کیوں نہ ہو) عقائد و مذہبی روایات کا نمائندہ اور وکیل نہ بنایا جائے، ایسا ممکن ہے، اور اس وقت بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں ایسا ہو رہا ہے، خود یورپ و امریکہ میں جہاں مذہبی احساس ہندوستان کی طرح تیز بھی نہیں ہے، اس کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے، انگریزوں کا دور حکومت ہمارے لیے کسی طرح لائق تقلید اور قابل رشک نہیں، لیکن اس بارے میں اس کی مثال دی جاسکتی ہے کہ اس دور میں نصاب کی کتابیں بالکل غیر جانبدارانہ اور نامذہبی ہوتی تھیں، اور ان میں کسی فرقہ یا قوم کی مخصوص چھاپ اور اس کے مذہب کی جھلک نہیں ہوتی تھی، یہی طرز عمل ہندوستان کے لیے ہر زمانہ میں مناسب ہے۔

تعلیم میں اخلاقی عنصر

البتہ اگر اخلاقی عنصر کو تعلیم کا جزو بنانے کا خیال ہے اور اس سے ذہنی اور اخلاقی تربیت حاصل کرنے کے مقصد سے یہ ضروری سمجھا جائے کہ بعض روحانی شخصیتوں، معلمین اخلاق، اور پیشوایان مذہب کا ذکر ہو تو پھر اس کا لحاظ ضروری ہے کہ پوری فراخ دلی کے ساتھ ان ناموروں اور اخلاقی و روحانی شخصیتوں کا تعارف ہو جن کی اخلاقی بلندی، پاکیزہ نفسی، روحانیت، خدمت خلق، سچی خدا پرستی اور انسانیت دوستی ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے، خواہ وہ اپنے عقائد و اعمال کے لحاظ سے کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، ان دور استوں (ایک کامل غیر جانبداری و نامذہبیت، اور ایک مکمل رواداری و بے تعصبی) کے علاوہ اس ملک کے لیے کوئی

تیسرا راستہ نہیں ہے۔

حیرت اور مایوسی

حضرات! اس معیار سے جو ہر طرح عادلانہ اور عاقلانہ ہے، اور جس کی پشت پر اصول تعلیم اور انسانی نفسیات کے دلائل کا ایک دفتر اور تاریخی واقعات اور حقائق کا ایک لشکر ہے، جب ہم اپنی ناندھی (Secular) ریاست کے ناندھی نظام تعلیم و نصاب تعلیم کو جانچتے ہیں تو ہم کو بڑی مایوسی اور حیرت ہوتی ہے، ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ ان دو راستوں میں سے جو ہندوستان کی نوخیز جمہوری حکومت کے لیے ہر طرح موزوں و مناسب تھے، کوئی راستہ اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ ایک تیسرا راستہ اختیار کیا گیا ہے، جو اس ملک کے لیے بھی موزوں نہیں ہے جس نے کبھی بھی ناندھی ہونے کا اعلان نہ کیا ہو، چہ جائیکہ وہ ملک جو اپنے دستور میں بار بار ناندھی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

دیومالائی اثرات

ہم ایک طرف نصاب تعلیم کی وہ کتابیں دیکھتے ہیں جن میں صاف صاف اور نمایاں طور پر ایک ہی فرقہ اور ایک ہی عنصر کی مذہبی روایات، تاریخی شخصیات اور قدیم علم الاصنام (دیومالائی Mythology) کے اسباق ہیں، ان اسباق میں ان عقائد و تخیلات کو پیش کیا گیا ہے جو کم سے کم مسلمانوں کے بنیادی عقائد (توحید و رسالت) سے صرف یہی نہیں کہ مطابقت نہیں رکھتے، بلکہ ان کی تردید کرتے ہیں، مسلمان بچہ جو ان سرکاری مدارس میں تعلیم پانے پر مجبور اور دوسرے ذرائع تعلیم سے عام حالات میں محروم ہے، تعلیم اور نوشت و خواند کے نام سے ایسے عقائد و تخیلات قبول کرتا ہے جو ان بنیادوں سے متصادم ہیں، جن پر اس کے مذہب کی عمارت قائم ہے، اور جن کا اعتقاداً قبول کر لینا اس کے لیے ذہنی و اعتقادی ارتداد کے مرادف ہے، اگر اس کا ذہن سلیم ان کے قبول کرنے سے انکار کرتا ہے یا اس کے گھر کا ماحول اور تعلیم اس کی تردید کرتی ہے (جس کی موجودہ حالات کے لحاظ سے بہت کم

توقع ہے) تو اپنے نصاب کی بے وقعتی اور غیر معقولیت کا قائل ہوتا ہے، اور خود ایک کشمکش اور ذہنی الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے، یہ دونوں نتیجے کسی نظام تعلیم کے لیے اچھے اور قابل قبول نہیں، نہ یہ کہ بچہ جو مدرسے میں اپنے والدین کی امانت ہے، اپنے والدین کے عقائد اور اپنے مذہب کے بنیادی حقائق سے باغی ہو جائے، نہ یہ کہ وہ تعلیم بھی حاصل کرتا رہے اور اس کی فطرت سلیم اس کے قبول کرنے سے انکار بھی کرتی رہے، اور اس کو وہ بعید از قیاس اور ناقابل فہم بھی معلوم ہوتے رہیں۔

حکومت کی زیر نگرانی تیار کردہ نصاب میں جانبدارانہ طرز عمل

دوسری طرف آپ اردو کی وہ سرکاری کتابیں دیکھیے جو مختلف تعلیمی منزلوں کے لیے تجویز کی گئی ہیں، اور حکومت کے زیر نگرانی تصنیف ہوئی ہیں، ان میں کس طرح صرف ایک فرقے اور ایک مکتب خیال کی نمائندگی کی گئی ہے، اور صرف اس کی روایات، تقریبات اور مذہبی و تاریخی و سیاسی شخصیات (Heroes) کا انتخاب کیا گیا ہے، اور کس طرح دوسرے فرقوں اور جماعتوں (Communities) کی نامور شخصیتوں، قابل ذکر تقریبوں اور زندگی کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کیا گیا ہے، میں آپ کے سامنے صرف ایک نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یوپی کے محکمہ تعلیم نے اردو کی جو ہیسک ریڈریں تیار کرائی ہیں، ان میں بزرگوں اور شخصیتوں کے سلسلہ میں صرف شری رام چندر جی، شری کرشن جی، سورداں، تلسی داس، میر بابائی کے متعلق اسباق ہیں، تیرتھوں اور مذہبی مقدسات میں صرف اجودھیا، متھرا، کاشی، پریاگ، گزگا، رامائن کا تذکرہ ہے، تاریخی واقعات میں سے بھرت ملاپ، دھنش یگ پر بلا د کا انتخاب کیا گیا ہے، رہنماؤں اور لیڈروں میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، ایبٹور چندو دیا ساگر، مدن موہن مالوی تلک، لالہ لاجپت رائے، سردار پٹیل، راجندر پرشاد، سروجنی نانڈو، پنڈت پنت، ٹنڈن جی کا نام ملتا ہے، پورے سلسلہ میں کہیں کسی مسلمان شخصیت، کسی اسلامی تقریب، کسی تاریخی روایت حتیٰ کہ جنگ آزادی کے بھی کسی مسلمان قائد اور رہنما کا تذکرہ نہیں ہے، اگرچہ اس سلسلہ میں منگل پانڈے، تاننیا ٹوپی اور بھگت سنگھ تک کو فراموش نہیں کیا گیا ہے۔

ایک کھلی نا انصافی

میں یہ عرض کروں گا کہ یہ صرف مسلمانوں کے ساتھ نا انصافی نہیں ہے؛ بلکہ ہندوستان کے ساتھ بھی بڑی نا انصافی ہے کہ اس کو خواجہ معین الدین اجمیری جیسے کامل انسان، مخدوم شرف الدین یحییٰ بہاری جیسے خدا شناس، نظام الدین اولیاء جیسے سچے خدا پرست، ناصر الدین محمود جیسے درویش صفت بادشاہ، شیر شاہ سوری جیسے اعلیٰ مدبر و منتظم، امیر خسرو جیسے شاعر خوش نوا و فخر ہندوستان، عبدالرحیم خان خانانا جیسے جامع کمالات انسان، شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے حکیم و فلسفی، ٹیپو سلطان جیسے غیور و بلند ہمت انسانوں کی پیدائش، اور پرورش کے شرف سے محروم کر دیا جائے، جن کی وجہ سے ہندوستان کا پایہ سارے مشرق اور پورے ایشیا میں بلند ہے، اور بڑے بڑے اہل کمال کا سر عقیدت اس کے آگے خم ہے، یہ نئی نسلوں کے ساتھ بھی نا انصافی ہے کہ ان کو انسانیت کی ان تابناک مثالوں اور ہندوستان کے ان سرمایہ فخر فرزندوں کے نام اور کام سے واقف ہونے کا کوئی موقع نہ دیا جائے، جن کی زندگی صرف اسی ملک کے لیے نہیں، دنیا کے تمام نوجوانوں کے لیے قابل تقلید، اور ان کا کردار انسانی سیرت کی تعمیر اور شخصیت کی تکمیل کے لیے ایک بیش بہا طاقت ہے۔

ایک اہم مسئلہ

حضرات! انصاف کی یہ نوعیت، نظام تعلیم کا یہ جارحانہ رجحان اور اس کے مرتبین کی یہ کوتاہ نظری مسلمانوں کی قومی زندگی کا سب سے اہم اور دشوار مسئلہ بن گیا ہے، دوسرے معاشی و سیاسی مسائل اس مسئلہ کے مقابلہ میں ہیچ ہیں، مسلمانوں کو جب تک اس کی طرف سے اطمینان نہ ہو کہ ان کی آئندہ نسلیں اسلام پر قائم رہیں گی، اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کسی قومیت اور نسل کا نام نہیں، وہ عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے، اس وقت تک مسلمان ایک شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا رہیں گے، اور ان کو اپنے مستقبل کی طرف سے وہ اطمینان و سکون حاصل نہیں ہوگا جو اس قوم کے لیے ضروری ہے، جو اپنے ماضی کے اعتبار سے بھی اور اپنی موجودہ صلاحیت اور تعداد کے اعتبار سے بھی اسی ملک کی تعمیر و ترقی کا ایک اہم

غض ہے، مجھے معلوم ہے اور آپ حضرات بھی بے خبر نہ ہوں گے کہ حساس مسلمانوں کا ایک طبقہ شدید کشمکش میں مبتلا ہے، اسی کشمکش کا نتیجہ وہ تاریخی کنونشن ہے جو تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے گذشتہ جنوری میں بمبئی میں منعقد ہوا، اور جس میں سارے ملک سے مسلمانوں کی مختلف انجیال جماعتوں اور اداروں نے شرکت کی، بہت سے مسلمان اس مسئلہ کے حل سے مایوس ہو کر یا مستقبل کی خطرناکی کو دیکھ کر اس ملک کو چھوڑ دینے پر غور کرنے لگے ہیں، اور میرے اور آپ کے لیے یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے کہ بہت سے خاندانوں نے محض اسی وجہ سے اس ملک کو خیر باد کہہ دیا، میں اس شکست خوردہ ذہنیت کا سخت مخالف ہوں، اور اس کو مسئلہ کا حل بالکل نہیں سمجھتا، اس کو اس عظیم تعداد کے ساتھ بے وفائی بھی سمجھتا ہوں جس کو اس ملک میں رہنا ہے، لیکن اس سے بہر حال مسلمانوں کی شدت احساس اور تلخی احساس کا اظہار ہوتا ہے، اور ہمیں سنجیدگی کے ساتھ اس واقعہ پر غور کرنا چاہیے۔

خلاف عقل و عدل تعلیمی صورت حال اور اس کا مقابلہ

اس صورت حال کا مقابلہ۔ جو خلاف عقل بھی ہے اور خلاف عدل بھی، جو مسلمانوں کے ملی وجود کے لیے بھی خطرہ ہے اور ہندوستان کی سیاسی قوت و عظمت کے لیے بھی۔ دو طرح سے ممکن ہے، ایک یہ کہ پوری قوت و جرأت کے ساتھ اس کا مطالبہ کیا جائے کہ ہماری ناند ہی ریاست کا نظام تعلیم پوری دیانت داری کے ساتھ ناند ہی ہو، اس نصاب تعلیم سے وہ تمام اجزاء خارج کیے جائیں جو مذہبی اور کسی خاص فرقہ کی تعلیمات و عقائد و تاریخ کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ بنیاد ہر طرح معقول و مستحکم ہے، آپ جو اس ملک میں قیام کا فیصلہ کر چکے ہیں، جو یہاں پیدا ہوئے اور یہاں کے شہری ہیں، جو حکومت کے محاصل و مطالبات ادا کرتے ہیں، جن کو حق رائے دہندگی حاصل ہے، جو حکومتوں اور وزارتوں کی تشکیل میں دخل ہیں، جن کو کوئی حکومت اور کوئی سیاسی پارٹی نظر انداز نہیں کر سکتی، جن کی رائے اور تعداد کا پانسنگ ہر پلڑے کو جھکا سکتا ہے، ان کو تمام خصوصیتوں سے قطع نظر محض ہندوستانی اور شہری ہونے کی بنا پر بھی اس کا حق ہے کہ وہ اس کا مطالبہ کریں کہ اس ملک کا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم ان کے بنیادی عقائد اور ان کے مذہبی جذبات و ضروریات کے مطابق ہو یا کم سے کم

ان کو مجروح کرنے والا اور ان کو چیلنج کرنے والا نہ ہو، اس مطالبہ میں ہندوستان کے تمام معقولیت پسند عناصر آپ کی تائید کریں گے، اور یہ صورت حال جس میں زیادہ دن باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے اور جو بالکل غیر طبعی اور خلاف فطرت ہے، جلد تبدیل ہو جائے گی، لیکن اس کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ مسئلہ آپ کی زندگی کا اہم ترین مسئلہ ہے، اور آپ کے لیے مذہبی و روحانی طور پر موت و زندگی کا سوال ہے، اور آپ کے لیے اس کے مقابلہ میں کوئی اور متوازی راستہ نہیں ہے۔

صحابی و مسائی مکاتب کا قیام

دوسرا اہل یہ ہے کہ آپ اپنے ان بچوں کی دینی و اخلاقی تعلیم کا خود بھی بندوبست کریں، جو جبری تعلیم کے قانون کے مطابق سرکاری مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں، اس کا اہل اور قابل عمل راستہ یہ ہے کہ آپ اس مقام پر جہاں مسلمانوں کی کچھ تعداد آباد ہے، صحابی و مسائی مکاتب و مدارس کا انتظام کریں، جہاں آپ کے بچے سرکاری اسکول جانے سے پہلے ایک آدھ گھنٹہ یا سرکاری اسکول سے آنے کے بعد ایک آدھ گھنٹہ دینی تعلیم حاصل کریں۔

دوطاقتیں

اس سلسلہ تعلیم کے قیام اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے: ایک عزم کی، دوسرے نظم کی، ان دو طاقتوں سے ہزاروں کی تعداد میں ایسے مکاتب و مدارس قائم ہو سکتے ہیں، وسائل و ذرائع ہر دور میں اور ہر ملک میں انسانی فیصلہ اور عزم کے تابع رہے ہیں، عزم نے ان کو حاصل کیا اور نظم نے ان کو کارآمد اور دور رس بنایا، اب بھی جہاں کہیں یہ دو چیزیں پیدا ہو گئیں ہیں انھوں نے وسائل کو بھی مسخر کر لیا ہے، اور موانع کو بھی مغلوب بنا لیا ہے، میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ کم سے کم دو مقامات (ضلع بستی اور شہر سیتا پور) میں عزم اور نظم نے اس مشکل کو آسان کر کے دکھا دیا ہے، اور بتا دیا ہے کہ ہر مقام پر انھیں دو طاقتوں سے اس مہم کو سر کیا جاسکتا ہے، اور مدارس و مکاتب کا ایک ایسا غیر سرکاری جال بچھایا جاسکتا ہے جس کے ذریعہ ہزاروں بچے اپنے عقائد و فرائض اور دینیات اور اردو کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک اہم مطالبہ

حضرات! آپ نے اپنے ایک گمنام کارکن اور سپاہی کو (جس کا دائرہ عمل جلسوں اور کانفرنسوں سے دور دور رہا ہے) ایک اہم تعلیمی کانفرنس کی صدارت کی عزت بخشی، سپاہی حقیقت پسند اور عملی ہوتا ہے، میں آپ سے آخر میں اسی کا مطالبہ کرتا ہوں کہ آپ اپنے آہنی عزم اور عقائد نہ نظم سے اپنے تعلیمی اور دینی مستقبل کو اس ملک میں محفوظ بنائیں، جہاں آپ نے رہنے کا فیصلہ کیا ہے، اور جس کو آپ کے پیغمبرانہ پیغام کی ضرورت ہے، آپ اپنی متحدہ آواز اور پُر امن لیکن طاقتور احتجاج سے نظام تعلیم کے اس نقص کو دور کریں جو اس ملک کے بنیادی دستور اور سیاسی منشور کے بھی خلاف ہے اور اس ملک کی قدرتی ساخت اور واقعات کے بھی خلاف ہے، آپ مطالبہ کریں کہ وہ نظام تعلیم یا تو خلوص اور دیانت داری کے ساتھ نامذہبی ہو، یا انصاف و رواداری کے ساتھ مذہبی، ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ نہیں، دوسرے اپنے عزم و نظم سے صبحی و مسائی مکاتب و مدارس کا جال بچھا دیجیے، اور ہر سرکاری مکتب اور مدرسہ کے ساتھ ایک دینی مدرسہ اور مکتب قائم کیجیے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ صرف اس ایک اجتماع میں مختلف گاؤں، قصبات اور شہروں سے آئے ہوئے وہ مخلص اور صاحب اثر مسلمان اور اہل علم ہیں کہ اگر وہ تمہا اس کا عزم کر لیں کہ وہ واپس جا کر ایسے مدارس اور مکاتب قائم کریں گے، تو سیکڑوں کی تعداد میں ایسے مدرسے قائم ہو سکتے ہیں، اور جہاں تک اضلاع مشرقی کا تعلق ہے یہ مسئلہ بہت حد تک حل ہو سکتا ہے، میں ان سب بزرگوں اور دوستوں سے عرض کروں گا۔

غافل منشیں نہ وقت بازیست

وقت ہنراست و کار سازیست

(۱) وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالَى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَصَحْبِهِ اٰجْمَعِينَ۔ (۱)